ہے عمل میں کامیابی موت میں ہے زندگی
جا لپٹ جا لہر سے دریا کی کچھ پرواہ نہ کر

المنار

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۴

المنار

تعلیم الاسلام کالج لاہور

نگران
فیض الرحمٰن قیضی ایم اے

ایڈیٹر
رشید قیصرانی۔

فہرس!

شمار	عنوان	صاحب قلم	صفحات
۱	اداریہ	ادارہ	۳
۲	اسلامی شعار کی اہمیت	صوفی بشارت الرحمٰن ایم۔اے	۶
۳	زمانۂ آنحضرت صلعم کا رسم الخط		۱۲
۴	گر بدولت بری مست نہ گردی مردی	جنید ہاشمی	۱۵
۵	یونیورسٹی	صوفی عبدالعزیز ایم۔اے	۱۶
۶	صدر اسلام کا تاریخی افسانہ	اخوند فیاض احمد	۱۹
۷	شرح سیلاب	ن۔ ریاض ملک	۲۴
۸	شریعت اسلامیہ کا نفاذ	رشید قیصرانی	۲۵
۹	آپ سے ملئے؟	محمد اسلم چوہان	۲۹
۱۰	غزل	حسام الدین ظفر	۳۰
۱۱	ایک رات	مجیب الرحمٰن صادق	۳۱
۱۲	اُردو شاعری پر ایک نظر	مصلح الدین بنگالی	۳۲
۱۳	زندگی	بشیر احمد رفیق	۳۷
۱۴	سیلانی کا سفرنامہ	اسلم باجوہ "سیلانی"	۳۹

(پبلشر جنید ہاشمی نے انشا پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا)

اداریہ

(۱)

طلباء اور عملی سیاست

کسی آزاد ملک اور قوم کا عروج اُس قوم کے نوجوان طبقے کے ذہنی ارتقاء سے وابستہ ہوا کرتا ہے۔ وہی قوم صحیح معنوں میں ترقی یافتہ کہلانے کی مستحق ہے جس کے نوجوان وقت کی دھڑکنوں کو پہچان سکیں۔ اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں اور فی زمانہ مادی علوم میں دنیا کی حیرت انگیز ترقی اور وقت کے بدلے ہوئے تیور زبانِ حال سے یہ بتا رہے ہیں کہ اس دور کے سیاسی اور اقتصادی بحران میں صرف وہی قومیں زندہ رہ سکیں گی۔ جو ہر لحاظ سے خود اپنی کفیل ہوں۔

اس لئے پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو صنعتی، اقتصادی اور دفاعی اعتبار سے مضبوط ترین ملک بنانے کیلئے اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی قوم میں بلند پایہ سائنسدان۔ اقتصادیات کے ماہر اور بہترین انجینئر پیدا کریں تاکہ ہمارا ملک دوسرے ممالک کے دوش بدوش کھڑا ہو سکے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے۔ جب ہمارے طلباء مختلف علوم میں ٹھوس قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

یونیورسٹی سے ایم، اے یا ایم، ایس، سی کی ڈگری حاصل کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن علوم متعلقہ میں معیاری صلاحیت اور قابلیت صرف اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے کہ ایک طالب علم کی تمام تر توجہ تعلیمی مشاغل پر مرکوز ہو۔ جو طلباء حصولِ تعلیم میں کما حقہٗ دلچسپی نہیں لیتے اور اپنے مطمحِ نظر سے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں، وہ اپنی تعلیم کا مقصد خود فوت کر لیتے ہیں۔ خواہ ان کے اختیار کردہ ثانوی مشاغل اُن کے نزدیک کتنے ہی مفید کیوں نہ ہوں۔ ایسے طلباء اپنی آئندہ زندگی میں نہ اپنے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں نہ اپنے ملک کے لئے۔

ہمیں آزاد ملک کی صحت مند سیاست کے افادی پہلو سے انکار نہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سیاسی امور سے باخبر رہنا ایک آزاد ملک کے ہر شہری کا فرض ہے۔ اس ضمن میں طلباء بھی آجاتے ہیں۔ بایں ہمہ سیاسیات میں حصہ لینے والے طلباء نہ صرف اپنے تعلیمی مطمحِ نظر سے دُور ہٹ جاتے ہیں، بلکہ وہ اپنی تعلیم میں بھی وہ مہارت اور قابلیت پیدا نہیں کر سکتے۔

پنجاب کی انتخابی مہم سر پہ ہے اور بعض خود غرض لیڈر صرف اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے اِس نوجوان طبقہ کے بیدار مغز مگر کھوکھلے نعرے خریدنا چاہتے ہیں۔ الیکشن کے امیدوار حضرات ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں کہ قوم و ملک کے بہترین دماغوں کو جو مستقبل قریب میں ملک کی صنعتی، اقتصادی، علمی، معاشی اور معاشرتی ترقیوں کے ضامن ہیں۔ اگر انہوں نے انہیں اپنی راہ سے بھٹکا دیا۔ تو پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو جو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اُس کی ذمہ داری صرف اُن کے سر اور کاندھوں پہ ہوگی۔ کیونکہ اگر طلباء انتخابات میں اُن کے اشاروں پر ناچنے لگے اور اپنا تعلیمی بیش بہا وقت ضائع کر دیا۔ تو ظاہر ہے کہ امتحان کے وقت "وار" ڈگریاں حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیں گے۔ اگر ان کے

پیشِ نظر یہی مقصد ہے تو واضح ہے کہ وہ نہ ہمارے خیر خواہ ہیں نہ ہمارے ملک کے۔

ہمارے طلباء کو یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ کھوکھلے نعرے لگانا اور کسی سیاسی جماعت کو زندہ باد کہہ دینا سیاست نہیں۔ سیاست میں حصہ لینے کے لئے جس سیاسی شعور کی ضرورت ہے، وہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ سیاست سے متعلقہ تمام مضامین میں مہارت حاصل نہ کی جائے۔ ایک آزاد ملک کی سیاست کا مقصد صرف یہ ہونا چاہیئے کہ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے اعلیٰ علوم کے ماہر اور بہترین قابلیتوں کے مالک ہوں۔ ان کے اندر سیاستدان، قانون دان اور بیدار مغز حکمران ملک کی صنعتی ترقی اور اقتصادی اور عسکری مضبوطی کے لئے اہل ترین افراد سامنے آئیں۔ اور ملک کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو ساحلِ مراد تک لے جانے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد ملکوں کے طلباء دورانِ تعلیم میں کسی دوسری طرف توجہ نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ دورانِ تعلیم میں اگر دیگر مشاغل میں شرکت کی جائے تو ان کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ جو انکی عملی زندگی اور خود ملکی نظام میں خرابیاں پیدا ہونے کا باعث بنیگی۔ اور وہ خود ملک کے مستقبل کی ہلاکت کا باعث بن جائیں گے۔

(۲)

ہمارے لکھنے والے

صوفی بشارت الرحمٰن ایم۔ اے کے مضمون کی دوسری قسط اس شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر "اسلامی شعار کی اہمیت" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد قوموں کے لئے اپنے مخصوص تہذیب و تمدن کو رواج دینے کی خاطر قومی شعار کی وضاحت ایک بہت ہی نازک مرحلہ ہے۔ بالخصوص ہمارے محاطہ میں جبکہ صدیوں کی غلامی کے بعد پامال ذہنیتوں اور فرسودہ روایات کو مٹا کر نئی روایات کو استوار کرنا مقصود ہو۔ ہمارے اس مغرب زدہ نوجوان طبقے کے لئے جو اپنے پرانے آقاؤں کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے، یہ مضمون کافی فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اسے اپنی غلامانہ ذہنیت سے نہیں بلکہ ایک آزاد ملک کے غیور شہری کی حیثیت سے پڑھیں۔

ن۔ ا۔ ریاض نے تاریخ اسلام کا یہ عظیم الشان واقعہ "ہمارے اسلاف کے کارناموں" کے مستقل عنوان کے تحت قلم بند کیا ہے۔ موجودہ سوسائٹی کی مغرب زدہ مسلمان عورتوں کے لئے خصوصاً اور دوسری مسلمان خواتین کے لئے عموماً تازیانۂ عبرت ہے۔ صدیوں کی سحر آفرین غلامی کے بعد مسلمانوں کی سوئی ہوئی قسمت نے ایک بار پھر انگڑائی لی ہے اور اب جبکہ ایک طویل مدت کے بعد ہم آزاد فضا میں سانس لینے کے قابل ہوئے ہیں۔ باطل اپنی روایاتی غاصبانہ ذہنیت کی وجہ سے ہمیں محکوم بنا لینا چاہتا ہے۔ کشمیری مسلمانوں کی بے بسی آج ایک دفعہ پھر حضرت ضرارؓ کے واقعہ کی یاد کو تازہ کر رہی ہے۔ کیا پاکستان کے آزاد مسلمانوں میں ایسے اولوالعزم نوجوان موجود ہیں جو زندگی اور موت سے بے نیاز ہو کر حالات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے صرف خدا کے بھروسہ پر اپنی آزادی کو برقرار رکھنے اور کشمیری مسلمانوں کو پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا سکیں؟ کیا ہماری مسلمان بہنوں کے اندر ان عالی مرتبت خواتین کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہمت موجود ہے۔ جنہوں نے حضرت خولہؓ کی طرح اپنے مظلوم بھائیوں کو آزاد کرانے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کی؟ اگر نہیں! تو اب بھی وقت ہے کہ ہم اپنے اندر مجاہدانہ روح، ذوقِ عمل اور یقین محکم پیدا کریں۔ امن کے نام نہاد ٹھیکہ داروں اور انصاف کے ڈھنڈورچیوں سے آس لگانا اپنے قوتِ بازو کی تضحیک کرنا ہے، اگر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے اندر اسلاف کی سی زندگی کی لہر دوڑانا ہوگی، انکی مغرب المثل بلند کرداری، بلند ہمتی،

اولوالعزمی اور عالی حوصلگی کو اپنانا ہوگا۔ اس کے بغیر آج زندہ قوموں کی صف میں کھڑا ہونا قطعی ناممکن ہے۔

رشید قیصرانی نے اپنی نظم "سُرخ سیلاب" کی تند و تیز موجوں پر اترانے والے اُن نام نہاد پاکستانی "سُرخوں" کے متعلق لکھی ہے جنہیں سُرخ ستارے کی ہلکی سے ہلکی کرن بھی نظر آجاتی ہے۔ لیکن سبز پرچم پر چمکتا ہوا چاند ستارہ دکھائی نہیں دیتا۔ جن کی نظریں مشرق سے اُبھرتے ہوئے سُرخ سویرے کی طرف لگی رہتی ہیں، جنہیں ہر وقت کسی سُرخ نظام کی آمد کا انتظار رہتا ہے۔ جو اپنی مادرِ وطن سے زیادہ روس کو عزیز جانتے ہیں۔ جنہیں استعمار کی زبان میں "سُرخ" سیاسی زبان میں کمیونسٹ اور ادبی حلقوں میں "ترقی پسند" کہا جاتا ہے۔ انسانیت کے بہی خواہ "یہ سرخے" انسان پر جو قیامتیں ڈھا رہے ہیں۔ اِس نظم میں انکی طرف بھی لطیف اشارے موجود ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔ ؎

مطلع چین سے پھوٹے ہیں لہو کے دھارے ✦ تم اسے سُرخ سویرے کا لقب دیتے ہو

حسام الدین ظفر کی مستحسن کاوش "آپ سے ملئے" ہمارے مستقل عنوان "ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے" کی زینت ہے۔ اس میں آپنے ان نام نہاد مسلمانوں پر گہری طنز ہے۔ جنہوں نے شاید بدقسمتی سے انگلستان کی بجائے پاکستان میں جنم لیا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں ایسے حضرات کی موجودگی ایک شرمناک امر ہے۔ بالخصوص اِن حالات میں جبکہ ہمارے عوام اِسلام کے دوبارہ عروج کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ملک کے نوجوانوں میں مغرب کی تقلید اور "انگریزیت" کی غلامی کا اگر یہی عالم رہا تو ڈر ہے کہ ملک نقالوں اور بھانڈوں کا اڈا بن کر نہ رہ جائے۔ ہمارے نوجوانوں کو نقالی کی یہ روش ترک کر کے ملک و ملت کی ٹھوس خدمت کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔

سیلانی۔ "سیلانی کے سفرنامے" میں سیلانی کا مخصوص طنزیہ اندازِ گفتگو واقعی قابلِ تعریف ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ ساتھ اُسکا ذہنی انتشار اور چڑچڑا پن اگر قابلِ داد نہیں تو قابلِ رحم ضرور ہے۔ بیچارے کو تمام سفر میں صرف شاعروں سے ہی واسطہ پڑا اور وہ بھی کچھ "سُرخ" اور کچھ "سبز" قسم کے شاعروں سے۔ لیکن یہ حضرت بھی آخر سیلانی ہیں۔ اِس طرح ہاتھ دھو کر ان سب کے پیچھے پڑے ہیں کہ ہمیں بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ سیلانی اگر شاعر نہیں تو "شاعر شکن" ضرور ہے۔ انکی خدمت میں ہمارا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنے یارِ غار "زیروی" کی معیت میں ایک "شاعر توڑ" ہفتہ منائیں۔ جس میں وہ اِن تمام "بادام" قسم کے شاعروں کے خلاف جن کے ظاہر و باطن میں اُنہیں نفاق نظر آتا ہے۔ ادبی جہاد کریں۔ اِس طرح شاید دوسروں کی بجائے "عوام کی جیب پر اکرام فرمانے" کا سنہری موقع آپ کے ہاتھ آجائے اور "حکومت کے عمال" کو غور اور سنجیدگی سے کام لینے کی زحمت سے بھی نجات مل جائے۔

(۳)

آہ! تاثیر، تاجور، سیماب

ہم بڑے افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ گذشتہ چند ماہ میں یہ تین ادیب شاعر شخصیتیں اس جہان سے اٹھ گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ ڈاکٹر تاثیر شاعر و ادیب ہونے کے علاوہ ملک کے تعلیمی حلقوں میں بھی ایک خاص شہرت و عزت کے مالک تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ انکی وفات پر ہم انکی اہلیہ محترمہ کرسٹابل تاثیر اور انکے بچوں کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ علامہ تاجور نجیب آبادی صدر شعبہ اسلامیات و فارسی و اُردو دیال سنگھ کالج لاہور کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے آپ نے بھی اپنی تمام عمر علم و ادب کی خدمت میں گذار دی۔ پنجاب میں اردو زبان کی صحت و ارتقاء میں آپکو بہت بڑا دخل تھا۔ انکی وفات کا صدمہ ابھی کم نہ ہوا تھا کہ ملک کے مشہور شاعر سیماب اکبرآبادی کی وفات حسرت آیات کی خبر علمی و ادبی حلقوں میں نئے سرے سے رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ ہم ادارہ "المنار" کی طرف سے اِن سب کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالےٰ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

صوفی بشارت الرحمٰن ایم۔ اے

اسلامی شعار کی اہمیّت

اسلام نے ظاہر سے تعلق رکھنے والے احکام کیوں صادر کئے ہیں؟

(قسط دوم)

اب میں اس سوال کو لیتا ہوں کہ ظاہر سے تعلق رکھنے والے بعض امور کے متعلق جنہیں ہم اسلامی شعار کا نام دیتے ہیں اسلام نے کیوں احکام صادر فرمائے ہیں۔ سو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اوّل۔ چھوٹے چھوٹے امور میں ہمیں احکام دئے گئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ہمارے سامنے رکھا گیا ہے۔ مثلاً داڑھی رکھنا، دائیں ہاتھ سے کھانا، ہر چیز کو داہنی طرف سے شروع کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ اس لئے کہ اس نظام ظاہری اور باطنی کے ذریعہ سے ہمارے اندر ایک خاص قسم کی یکرنگی اور اتحاد پیدا ہو۔ کیونکہ ظاہر کا اثر باطن پر پڑتا ہے۔ مثلاً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نماز پڑھتے ہوئے اپنی صفوں کو سیدھا کر لیا کرو۔ ورنہ تمہارے دل ٹیڑھے ہو جائیں گے۔ یعنی اگر ان ظاہری باتوں میں تم یکرنگ نہ ہو گے تو تمہاری باطنی یکرنگی باطنی اتحاد اور محبت و الفت بھی جاتی رہیگی۔ پس اسلام نے ہمارے ظاہری اطوار اور عادات کو یکرنگ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور ظاہری یکرنگی سے بھی آپس میں محبت و الفت بڑھتی ہے۔ اسی لئے بعض کالجوں نے اپنی اپنی وردیاں یعنی خاص قسم کا لباس طلبہ کے لئے مقرر کیا ہوا ہے کہ طلبہ کالج میں وہ لباس پہنکر آئیں۔ کیونکہ اس ظاہری یکرنگی کا باطن پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اسلام نے بڑے اور چھوٹے دونوں قسم کے احکام سے اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

دوسری وجہ چھوٹے چھوٹے امور میں احکام دینے کی یہ ہے کہ ہم اپنا ہر کام پہلے سے تیار کردہ ارادے کے ماتحت کریں تاکہ ہماری قوت ارادی ترقی کرے اور ہمیں مکمل طور پر منظم اور منضبط زندگی گذارنے کی عادت ہو۔ اگر ہماری ٹریننگ اس قسم کی ہو کہ ہم اپنے اکثر کام غیر ارادی طور پر کرتے ہوں تو یہ سستی اور غفلت ہمارے بڑے کاموں پر بھی اثر انداز ہوگی لیکن جو قوم چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی ایک نظام اور ضبط پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ اپنے اندر ایک بارودی طاقت بھر لیتی ہے۔ اور اس کی قوّتِ ارادی کے مقابلہ میں دُنیا کی کوئی قوم نہیں ٹھہر سکتی۔

پس مومن کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے چھوٹے چھوٹے کام بھی ایک سوچے سمجھے ہوئے ارادہ کے ماتحت ظہور پذیر ہوں۔ تا اس کے اندر بے پناہ قوت ارادی پیدا ہو جائے۔ اسی لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اَلدُّنْیَا سِجْنٌ لِّلْمُؤْمِنِ وَجَنَّةٌ لِّلْکَافِرِ۔ یعنی مومن کی ہر چیز خدا اور اُس کے رسولؐ کے احکام کی قیود سے مقید ہوتی ہے اور کافر مادر پدر آزاد زندگی بسر کرتا ہے لیکن چونکہ یہ قید محبت کی قید ہے اور یہ زنجیریں محبوب کی طرف سے عائد کردہ ہیں۔ اس لئے مومن اس قید کو محسوس نہیں کرتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک الہامی شعر ہے کہ ؎

گر قضا را عاشقے گردد اسیر ٭ بوسد آں زنجیر را کز آشنا (تذکرہ طہ۳)

یعنی اگر قضا و قدر سے کوئی عاشق کبھی قید میں پڑ جائے تو وہ اُس زنجیر کو چوم لیتا ہے جو آشنا اور دوست کی طرف سے ہوتی ہے۔ بلکہ یہ چھوٹے چھوٹے احکام اور چھوٹی چھوٹی پابندیاں تو ایک طرف رہیں مومن تو اُن مصائب کی برداشت میں بھی لذّات محسوس کرتا ہے جو اُسے خدا کی خاطر برداشت کرنی پڑتی ہیں۔

مومن کے لئے یہ چھوٹی چھوٹی پابندیاں بوجھ کا باعث تو نہیں ہوتیں۔ ہاں اُن کے ذریعہ سے اسے ضبطِ نفس کی عادت پڑتی ہے۔ ان کے ذریعہ سے اس کی قوّتِ ارادی ترقی کرتی ہے۔ درحقیقت ضبطِ نفس کی حقیقی مشق چھوٹے احکام کے ذریعہ سے ہی ہوتی ہے۔ بڑے احکام تو اتنے اہم اور اتنے نمایاں ہوتے ہیں کہ موٹے سے موٹے ایمان والا انسان بھی انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا لیکن حقیقی ٹریننگ چھوٹے احکام کے ذریعہ ہی ہوتی ہے۔ اور ان کے ذریعہ ہی اطاعت کا مادہ زیادہ سے زیادہ ترقی کرتا ہے۔ اور ان چھوٹی چھوٹی روحانی ورزشوں سے ہی ہمارا دم یعنی STAMINA مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور ہم لمبی مسافتوں کو طے کرنے پر قدرت حاصل کرتے ہیں۔

تیسری وجہ ان چھوٹے چھوٹے اور ظاہری احکام کی یہ ہے کہ ان کے ذریعہ ہر دم ہی ہمارے دلوں میں خدا اور اس کے رسول کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے۔ یہ جذبہ کہ یہ کام بھی ہم خدا اور اُس کے رسول کی خاطر اور اُن کے احکام کے مطابق کر رہے ہیں۔ ہمارے اندر خدا اور رسول کی محبت کو زیادہ کرتا ہے۔ اور جوں جوں انسان اللہ تعالےٰ کے عشق میں ترقی کرتا ہے توں توں وہ خدا کی خاطر اپنی رہی سہی آزادی کو بھی قربان کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ یہ وہ غلامی ہے کہ جس کی لذّت دُنیا کی سب لذّتوں سے بڑھ کر ہے۔

اسلام نے ہماری زندگیوں کا مقصد ہی عشق جاودانی کا حصول قرار دیا ہے۔ جیسے کہ فرمایا کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (الذّٰریٰت رکوع ۳) کہ میں نے جن و انس کو اپنی محبت اور غلامی میں محو ہو جانے کیلئے پیدا کیا ہے۔ اور مومنوں کے متعلق فرماتا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ رکوع ۲۰) کہ مومنوں کی اللہ تعالےٰ سے محبت دنیا کی سب محبّتوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ محبت کا خمیر اللہ تعالےٰ نے فطرت انسانی میں اپنے لئے ہی رکھا ہے۔ نادان انسان حقیقی راستہ سے بھٹک جاتا ہے۔ اور اپنا نام زمرۂ ضالین میں لکھا لیتا ہے۔ لیکن بعض خوش قسمت اپنے اس فطرتی جذبے کو محبوب حقیقی کیلئے ہی وقف کرتے ہیں اور منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

تو نے خود رُوحوں پہ اپنے ہاتھ سے چھڑکا نمک ٭ جس سے ہے شورِ محبت عاشقانِ زار کا

پس آزادی اور ضمیر کی حریت کا تو سوال ہی نہیں۔ ہمیں کوشش اور دُعا کرنی چاہیئے کہ ہم مقامِ عشق پر کھڑے ہو جائیں۔ ایک عاشق تو اپنی رہی سہی آزادی کو بھی محبوب کے اشارہ پر قربان کرنا چاہتا ہے۔ کجا یہ کہ وہ اپنی آزادی اور حریت ضمیر اور پابندیوں کی شکایت کا راگ الاپنے لگے۔

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ ظاہر سے تعلق رکھنے والے یہ احکام ہمارے اندر ایک یکرنگی پیدا کر دیتے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یکرنگی کی ہمیں ضرورت نہیں۔ اگر ہمارے اندر یکرنگی نہ بھی ہو تو بھلا کونسا نقصان ہو سکتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی میں بہت سے جھگڑے اور فسادات اسی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے سے یکرنگ نہیں ہوتا۔

افراد ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو ایک دوسرے کے افعال و کردار کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ عادات و اطوار کا یہ اختلاف ہمارے اندر تنازعات اور جھگڑے پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے۔ پس جس حد تک زیادہ سے زیادہ قوم و ملت میں یکرنگی پیدا ہو سکتی ہو پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ قومی اتحاد و اتفاق اور باہمی محبت و الفت کا راز اِس میں مضمر ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے احکام ہی امیر و غریب۔ آقا و غلام۔ قوی و ناتوان کو ایک ہی لڑی میں پرو دیتے ہیں۔ اور اِس طرح سے اختلافات کے مواقع کم سے کم تر ہو جاتے ہیں۔ فوج میں ہر چیز میں یکرنگی اِسی حکمت کی وجہ سے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اِسلامی شعار سے کیا مُراد ہے؟

اِس عام بحث کے بعد اب میں اسلامی شعار کے بعض مخصوص ارکان کو ایک ایک کر کے لیتا ہوں۔ اور اُن پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔

شعار عربی زبان کا لفظ ہے۔ اسکی جمع شُعُرٌ و اَشْعِرَۃٌ ہے۔ شعار کے معنے جسم کے ساتھ لگے ہوئے کپڑے اور مخصوص نشان کے ہیں۔ اسلامی شعار سے عموماً مراد وہ لباس یا مخصوص ہیئت یا بعض مخصوص اطوار۔ اخلاق و عادات ہیں جو ظاہر سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے۔ یا جو مسلمانوں کی مخصوص نشانی بن گئے ہیں۔

یہ کہنا کہ فلاں امر اسلامی شعار کے خلاف ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

(۱) شریعت نے اس کے خلاف نصوص صریحہ کے ذریعہ احکام صادر کئے ہوں۔

(۲) لباس اور ظاہری باتوں سے تعلق رکھنے والی ایسی باتیں جو حقیقی اسلامی رُوح کے منافی ہوں۔ خواہ نصوص صریحہ میں ان کا ذکر نہ ہی ہو۔

(۳) ایسی باتیں جنہیں اسلام کے بزرگوں نے ناپسند کیا ہو۔ یا ان کا متفقہ نمونہ ان کے خلاف ہو۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَ سُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ۔ یعنی تم پر لازم ہے کہ میری سنت پر عمل کرو۔ اور اُن خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرو جو خدا کی طرف سے ہدایت دئے جاتے ہیں۔ اور اس سے یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تمام وہ بزرگ جو مَھْدِیِّیْن کے لفظ کے نیچے آ سکتے ہیں۔ جن کے متعلق ہم خیال کر سکتے ہوں کہ وہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں۔ ان کی پسند اور ناپسند اور طریق عمل بھی اِن امور میں کافی وزن رکھتی ہیں۔

اِسی طرح مثلاً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کے متعلق فرماتے ہیں کہ اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمْ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ۔ یعنی میرے صحابہ ستاروں کی مانند روشنی کا سامان پیدا کرنے والے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی رنگ میں تمہارے لئے مشعلِ راہ ہے جس کی راہنمائی سے تم ہدایت حاصل کر سکتے ہو۔ اِسی طرح فرماتے ہیں کہ عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل۔ میری اُمّت کے علماءِ ربّانی بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں۔

پس جو امور خلفاءِ راشدین اور ان کے تابع دُوسرے ایسے بزرگ جو مہدیین کے زمرہ میں شامل ہو سکیں مثلاً مجددین۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم و علماءِ ربّانی کے ارشادات اور انکی سنت کے خلاف ہوں اور انکی نگاہوں میں

ناپسندیدہ ہوں۔ وہ بھی اسلامی شعار کے خلاف سمجھے جائیں گے۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقی اسلامی رُوح کے حامل ہیں۔

اِس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام نے دُنیا کو مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَة قرار دیا ہے۔ یعنی آخرت کی کھیتی۔ پس تمام وہ امور جو ہمارے اندر غیر سنجیدہ پن پیدا کریں۔ ہماری رُوحانی ترقی میں روک بنیں وہ ناپسندیدہ اور شعار اسلامی کے خلاف ہونگے خواہ اُنکی مناہی کے احکام صریح طور پر شریعت میں مذکور نہ ہی ہوں۔ لہو ولعب میں انہماک۔ موسیقی اور راگ وغیرہ اسی رُوح کے ماتحت اسلام نے ناپسندیدہ اور بعض حالات میں ممنوع قرار دئے ہیں اور انہیں لہوُ الحدیث میں شامل کیا ہے۔ یعنی ایسے اُمور جن کے ذریعہ سے انسان اللہ تعالےٰ کو بھُول جاتا ہے۔ جیساکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ (لقمٰن رکوع ۱ پ ۲۱) یعنی لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ خدا سے غافل کرنے والی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ یہ اُمور انہیں اُن کے حقیقی مقصد یعنی اللہ تعالےٰ کی بندگی اور اس کی محبت کے حصول کے رستے سے ہٹاتے ہیں اور یہ صرف ان کی نادانی اور عدم معرفتِ علم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یعنی انہوں نے محبّت الٰہیہ کا مزہ ہی نہیں چکھا۔ اور نہ انہیں اس کی لذّت کا کچھ بھی علم ہے۔ اس لئے وہ نادانی سے نہایت ادنیٰ باتوں اور حقیر ترین لذّات کی طرف جھک کر اپنی منزل مقصود سے دُور جا گرتے ہیں۔ پس ہر وہ لباس، ہر وہ مشغلہ اور ہر وہ کام جو ہمیں دینی امور کی سرانجام دہی سے روکے اور انابت الی اللہ سے غافل کرے۔ وہ ناپسندیدہ ہوگا۔

جس شخص کا مقصد دیدار الٰہی اور محبت الٰہی کا حصول ہو وہ جائز و ناجائز کا سوال نہیں اُٹھایا کرتا۔ بلکہ اس کے لئے ہر وہ امر جو محبوب کے وصال میں تاخیر کا باعث بنے ناجائز ہوتا ہے۔ ہر وہ بات خواہ وہ جائز ہی ہو لیکن اس کے فرائض کو پُورا کرنے میں روک بنے وہ اُس کے لئے ناجائز ہو جاتی ہے۔ ایک سچا مومن تو خدا تعالےٰ سے ہر وقت اس بات کا طالب ہوتا ہے کہ اُسے قربانیوں کے نئے سے نئے مواقع ملیں تا اُسے اللہ تعالےٰ کے قرب میں بیش از پیش ترقی نصیب ہو۔ چنانچہ اسی کے پیش نظر قرآن کریم نے ہمیں یہ دعا سکھلائی کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی مومن اپنی موجودہ حالت پر کبھی قانع نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنے سے بڑھ کر منعم علیہ گروہ کے راستے کا ہمیشہ مطالبہ کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام قرآن کریم میں دُعا کرتے ہیں کہ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا (البقرہ رکوع ۱۵) کہ اے خدا ہمیں مزید قربانیوں کے مواقع میسر کر اور ہم پر مزید رحمت کا نزول فرما۔

پس ایک سچے مومن کے لئے ہر وہ چیز جو غفلت کا موجب ہو، ناپسندیدہ ہے۔ اگرچہ یہ معیار مختلف حالات و ازمنہ میں اپنی صورت بدل سکتا ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ایک خاص زمانہ اور بعض مخصوص حالات میں غفلت کا موجب ہوتی ہو۔ لیکن فی ذاتہٖ وہ بُری نہ ہو۔ بعض مخصوص حالات میں ہم اُسے ضرور مجرا رکھیں گے اور اُس سے اجتناب کرنے کی تلقین کرینگے۔ چنانچہ اس کی توضیح کے لئے مَیں یہاں بخاری شریف کی دو حدیثیں نقل کئے دیتا ہوں۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى فِيْ خَمِيْصَةٍ لَهَا اَعْلَامٌ فَنَظَرَ اِلٰى اَعْلَامِهَا نَظْرَةً فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ اذْهَبُوْا بِخَمِيْصَتِيْ هٰذَا اِلٰى اَبِيْ جَهْمٍ فَاِنَّهَا اَلْهَتْنِيْ اٰنِفًا عَنْ صَلَاتِيْ (بخاری کتاب الصلوٰۃ) یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی چادر میں نماز پڑھی جو منقش تھی۔ تو نماز میں آپکی توجہ اس کے نقوش کی طرف چلی گئی۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس چادر کو ابی جہم کے پاس پہنچاؤ۔ (اور واپس کر دو) کیونکہ اس نے میری نماز سے مجھے غافل کر دیا تھا۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ کَانَ قِرَامٌ لِعَائِشَۃَ سَتَرَتْ بِہٖ جَانِبَ بَیْتِہَا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمِیْطِیْ عَنِّیْ قِرَامَکِ فَاِنَّہٗ لَا تَزَالُ تَصَاوِیْرُہٗ تَعْرِضُ فِیْ صَلٰوتِیْ۔ (بخاری کتاب الصلوٰۃ) یعنی حضرت عائشہؓ نے سُرخ اُون کے منقش پردوں سے اپنے گھر کے ایک طرف میں پردہ کیا ہُوا تھا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان پردوں کو یہاں سے ہٹا دو۔ کیونکہ نماز میں میری توجہ اسکے نقوش اور اس کی تصاویر کی طرف منتقل ہوگئی تھی۔ ثابت ہُوا کہ مومن کے لئے ہر اس چیز سے احتراز واجب ہے جو اس کے دل میں رُوحانی اور دینی امور سے غفلت پیدا کرے۔

اس کے بعد یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بعض باتیں اپنی ذات میں بُری نہیں ہوتیں اور نہ اپنی ذات میں وہ غفلت پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ لیکن وہ بعض بُرے اُمور یا بعض بُرے لوگوں سے منسوب ہو جاتی ہیں۔ یا ان چیزوں کے ذریعہ سے ہم ذہنی طور پر بعض ممنوعات کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اِس لئے ان سے احتراز لازم ہو جاتا ہے۔ یا کم از کم ایک وقت تک ان سے علیحدہ رہنا ضروری ہوتا ہے۔ داڑھی رکھنے کا حکم بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیا تو اس کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی کہ خَالِفُوا الْمُشْرِکِیْنَ یعنی اس ذریعہ سے تم مشرکین سے مغائرت و مخالفت اختیار کرو۔ ضمنی طور پر یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آج اگر بعض مشرک داڑھی رکھنا شروع کر دیں تو مسلمان داڑھیاں منڈانی شروع کر دیں۔ ابتداءً اسکی یہ وجہ بیان کی گئی ہے۔ آئندہ کے لئے یہ چیز ہمارے مستقل شعار کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اور اس حیثیت کو کوئی شخص بعد میں تبدیل نہیں کر سکتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جب شراب حرام کی گئی تو شراب کے بعض مخصوص برتنوں تک کا دوسرا عام استعمال بھی تاکیدی طور پر منع کر دیا گیا۔ تا انہیں دیکھ کر لوگوں کے ذہن شراب کی طرف منتقل نہ ہوں۔ بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر کہ اب شراب سے صحابہ بہت متنفر ہو چکے ہیں ان برتنوں کے استعمال کی اجازت دے دی۔

پس وہ اطوار اور وہ ہیئت اور وہ لباس جو اِس وقت اسلام کی مخالف مغربی اقوام اور ان کی تہذیب سے مخصوص ہو گئے ہیں وہ کم از کم اُس وقت تک کے لئے جب تک کہ اسلام اور مغربیت کی جنگ لڑی جا رہی ہے ناپسندیدہ ہونگے۔ اگر ہم خود ہی مغربیت کی ذہنی غلامی کے شکار ہوں اور اُن کے فیشنوں کو اچھا سمجھیں اور انکی نقل میں اپنی عزت محسوس کریں۔ تو ہم اسلام کے سپاہی ہونے کا کس منہ سے دعوےٰ کر سکتے ہیں۔ پس ہر وہ لباس اور ہر وہ ہیئت جس میں مغربیت کی کوئی صورت پائی جائے اور اُسے اِسی نقطۂ نگاہ سے اختیار کیا جائے۔ ہمارے نزدیک ناپسندیدہ ہوگی۔ کیونکہ مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ (ابو داؤد) یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی قوم سے مشابہت پیدا کرتا ہے۔ وہ انہی میں سے ہو جاتا ہے اور ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مغربی تہذیب کی بعض باتیں اپنی ذات میں مفید ہوں۔ لیکن چونکہ وہ ان کی تہذیب کا مخصوص رکن بن گئی ہیں اس لئے عارضی طور پر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے اور مغربی تہذیب کی بہر حال مخالفت کرنے کی نیت سے ہم اس مفید چیز کو بھی چھوڑ دینگے۔ جیسا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم نے عارضی طور پر شراب کے برتنوں تک کو چھوڑ دیا تھا۔ ہاں جن باتوں کا پہلے سے ہی اسلام نے حکم دیا ہے۔ اُن میں سے بعض مغرب والوں نے اپنائی ہوئی ہیں اُن کے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ وہ تو ہماری ہی چیزیں ہیں جو اہلِ مغرب نے ہم سے ہی مستعار لی ہیں۔

اس وقت مغربی تہذیب دُنیا پر مسلّط ہے۔ مغربیت کی ہر چیز مادیت، دُنیا پرستی، حرص اور لالچ کی بنیاد پر قائم ہے اگر ہمیں اس تہذیب کا دنیا سے قلع قمع کرنا ہے تو ہمیں پُورے جوش و خروش کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اور اسکی ذہنی غلامی سے بچنے کے لئے جہاں تک ہو سکے اس کی مخالفت کرنی ہوگی۔ تاہم کسی رنگ میں بھی مغربیت کے رنگ میں رنگین نہ ہوں آج دنیا میں ہم وہی نقشہ دیکھ رہے ہیں جو آج سے تیرہ سو سال پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا میں نظر آتا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم اس حالت کا نقشہ یُوں بیان کرتا ہے۔ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (النحل رکوع ۸ پ ۱۴) یعنی اے محمد رسول اللہ! تجھ سے پہلے اُمتیں گمراہی میں مبتلا ہوئیں اور ہم نے اُن کی طرف اپنے رسول بھیجے لیکن شیطان نے انکے بُرے اعمال کو اُنکی نظروں میں خوبصورت کر کے دکھلایا۔ آج بھی شیطان دنیا والوں کا آقا و مولیٰ بنا ہوا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ عذاب الیم میں گرفتار ہونگے۔ موجودہ زمانے کی تہذیب اور اس کے علمبرداروں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (کہف رکوع ۱۲) یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی ساری کوششیں دُنیا کے حصول میں ہی صرف ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور طلبِ دنیا ہی انکی نظروں میں حسین ترین مشغلہ ہے۔ اور آخرت کی طرف یہ لوگ آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے

پس اگر ہم اسلام کے سپاہی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمیں اس تہذیب کے نام و نشان کو دُنیا سے مٹانا ہوگا۔ اور پوری ہمت اور عصبیت کے ساتھ اس کے مخصوص نشان کی مخالفت کرنی ہوگی۔ اس تہذیب کی قائم کردہ اقتدار (Values) کو بدلنا ہوگا۔ اور یہ خدائے علیم و خبیر کی پیشگوئی ہے کہ اس تہذیب کی موت ہمارے ہاتھوں مقدّر ہے۔ جو لوگ اس تہذیب کی نقل میں عزّت محسوس کرتے ہیں، وہ خطاکار ہیں۔ کیونکہ یہ تہذیب خدا کی نظر میں ذلیل ہے اور عنقریب دنیا میں بھی ذلیل ہونے والی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں ہمارا پیدا کرنے والا فرماتا ہے:۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (المنافقون رکوع ۱ پ ۲۸) یعنی دنیا میں آخرکار اللہ، اُس کے رسول اور مومنوں کی ہی عزّت دائمی طور پر قائم ہوگی۔ اور انہی کی پیش کردہ باتوں کو توقیر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ مگر افسوس کہ دو رنگی اختیار کرنے والے کمزور ایمان اور سادہ لوح لوگ اِس حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

(آئندہ قسط میں میں انشاء اللہ مخصوص طور پر بعض ان باتوں کا ذکر کرونگا۔ جن کی طرف میں خاص طور پر قارئین کی توجہ مبذول کرنی چاہتا ہوں۔ اور جن کی طرف آجکل کے زمانے میں خصوصیّت سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔)

جُنید ہاشمی

زمانۂ آنحضرت صلعم کا رسم الخط

دنیا میں رسم الخط کے جس قدر نمونے ملتے ہیں انکی تاریخ مصر سے شروع ہوتی ہے۔ مصری کاہنوں سے صرف پندرہ حروف لے کر اہل فنیقیہ نے سات مزید حروف کا اضافہ کیا۔ اور پھر ان بائیس حروف کی اصلاح و تہذیب کی۔ لیکن اس کے بعد یمن میں جا کر ان حروف میں عظیم تبدیلی پیدا ہوئی۔ اصلی مصری خط کی ابجد میں بائیس حروف تھے۔ جن میں اہل حیرہ نے معتدل اصلاح کی اور یہی خط تھا جو اوّل کوفی کہلایا۔ اور پھر اس میں مزید اصلاح ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ خلفائے بنی امیّہ اور خلفائے عباسیہ کی علمی قدردانی کے سبب خطِ کوفی جدید سے خطِ نسخ کے نام سے موسوم ہوا۔ عہد قدیم کے یہی بائیس مفردات تین تین چار چار حرفوں سے مرکب ہو کر چھ کلمات پر تقسیم ہو گئے۔ یعنی ابجد۔ ہوّز۔ حطی۔ کلمن۔ سعفص۔ قرشت = ۲۲ بعد ازاں چھ مزید حروف ث۔ خ۔ ذ (ثخذ) ض۔ ظ۔ غ (ضظغ) عربوں نے ایجاد کئے۔ یہ چھ حروف خاص لسانِ عرب سے مخصوص ہیں۔ کیونکہ دوسری زبانوں میں ان کے مخرج ہی نہیں ہیں۔ اس اضافہ سے عربی ابجد اٹھائیس حروف پر مشتمل ہو گئی۔ اور ان پر لفظے بھی عربوں نے لگائے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عربوں نے منازلِ قمر کے حساب سے اٹھائیس حروف وضع کئے۔ اور چونکہ سیارے سات ہیں۔ اس مناسبت سے عرب کا کوئی کلمہ سات حروف سے زیادہ نہیں ہے۔ حروف الزوائد زیادہ سے زیادہ بارہ ہیں جو ہر برجِ فلکی کے مطابق ہے۔

اسی طرح اعراب (زیر۔ زبر۔ پیش) تین ہیں۔ کیونکہ حرکت طبعی بھی تین ہیں۔ (حرکتِ نار۔ حرکتِ زمین اور حرکتِ فلک) ارباب لغت نے ابجد۔ ہوز کے عجیب و غریب معانی لکھے ہیں۔ کسی کا قول ہے کہ یہ ابجد بنانے والوں کے نام ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ یہ شیاطین کا نام ہے۔ کوئی انہیں سلاطین کا نام دیتا ہے۔ لیکن محققین کے نزدیک یہ سب مہمل روایات ہیں دراصل بات یہ ہے کہ علمائے ادب نے چھوٹے بچوں کو حفظ کرنے میں آسانی کے لئے ان کلمات کو ایجاد کیا تھا۔ اور اس ترتیب میں مخارج حروف کا بھی لحاظ رکھا تھا۔ یہ ترتیب صدیوں تک قائم رہی۔ لیکن چوتھی صدی ہجری میں ابن مقلہ کاتب نے اس ترتیب کو بدل کر ہم شکل حروف مسلسل لکھے۔ یعنی ب ت ث ج ح خ . . . الخ اور مزید آسانی یہ کی کہ امتیاز کے لئے حروف پر مدور نقطے لگا دیئے۔ نبی کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم عموماً اُمّی تھی۔ جیسا کہ خود قرآن شریف میں یہ آیت ہے۔ " قَدْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا " اُس زمانے میں چھاپہ خانے تو کجا کتابت وحی کے لئے کاتب ملنا دشوار تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا۔ اور اسلام دن بدن جزیرۃ العرب میں پھیلنا شروع ہوا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم الخط کی طرف توجہ فرمائی۔ جنگ بدر میں کفار میں سے ستر قیدی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں سے بجائے نقدی کے یہ فدیہ قرار دیا کہ ہر ایک قیدی کم از کم دس مسلمانوں کو علم الخط کی تعلیم دے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مسلمانوں میں تقریباً سات سو کاتبوں کا اضافہ ہو گیا۔ یا

یوں کہنا چاہیئے کہ کتابت کا پہلا مدرسہ مدینہ منورہ میں قائم ہوگیا۔

اُدھر مکہ معظمہ کے قبیلہ قریش میں صرف پندرہ سولہ اشخاص ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ جن میں سے حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عثمانؓ حضرت ابو عبیدہؓ۔ یزید بن سفیان۔ ابو حذیفہؓ۔ طلحہؓ۔ ابو سفیانؓ۔ معاویہؓ۔ مشہور صحابی ہوئے ہیں۔

اس کے بعد جب فتوحات میں اضافہ ہوا تو سرداران عرب اور سلاطینِ عالم کو تبلیغی خطوط بھیجنے کی ضرورت پیش آئی چنانچہ انہی میں سے مشہور کاتبوں نے یہ فرامین لکھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط فرمانروایانِ عجم اور مصر وغیرہ کو روانہ کیئے۔ اُن کا رسم الخط وہ ہے جو خطِ نبطی سے اہلِ یمن نے "مہذب خط" نکالا تھا۔ اسے "مُسند حمیری" کہتے ہیں۔ اس رسم الخط سے آگے چل کر خطِ حیری نکلا۔ اور پھر کوفہ میں اس کی اصلاح ہوئی۔ اس خط کو شہر کی نسبت سے "خطِ کوفی" تو ہم کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ وہ اصطلاحی خطِ کوفی نہیں جسے عوام خطِ کوفی کہتے ہیں۔ بلکہ یہ وہ خط ہے جس کو اہلِ یمن اور اہلِ مکہ نے حیرہ والوں سے حاصل کیا تھا۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فرامین کا ایک بڑا حصہ تو تلف ہوچکا ہے۔ لیکن ایک فرمان جو مسیلمہ کذاب کے نام لکھا گیا۔ اس کا عکس لندن کے پکچر میگزین میں ۱۸۹۶ء کے قریب شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایک فرمان جو مقوقس حاکمِ مصر کے نام ۶ھ میں تحریر ہوا۔ اُس کا عکس فتوح مصر مصنفہ ابن حکیم میں موجود ہے۔

اِس خط کو دیکھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس رسم الخط کو سوائے عربوں کے اور کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا کیونکہ حروف پر نہ اعراب ہیں اور نہ نقوط اور نہ علاماتِ اوقاف۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں جب مسلمانوں کی فتوحات عرب سے نکل کر اقصائے عالم میں پھیلنے لگیں۔ تو قرآن شریف کو ممالک مفتوحہ میں بھیجنا ضروری ہوگیا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں قرآن مجید کے چند نسخے مرتب ہوئے۔ لیکن اس خط میں سینکڑوں نقلیں کرنا محال تھیں۔

خطوط اور عام مراسلات کے علاوہ عہد عثمانی تک جس قدر قرآن شریف لکھے گئے، وہ سب اسی حیری خط میں تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جو قرآن پاک لکھا۔ اُس کا بھی یہی خط تھا۔ اس عہد تک قرآن کریم میں نقاط۔ اعراب اور علاماتِ وقف لکھنے کا دستور نہ تھا۔ اس کے علاوہ لفظ کو توڑ کر دو حصوں میں لکھنا معیوب نہ تھا۔ مثلاً "وَرَسُولُهٗ" کو پہلی سطر میں "وَرَ" اور اگلی میں "سُولُهٗ" لکھ سکتے تھے۔ بلکہ اُس وقت تک "ا" بھی سیدھا نہیں تھا۔ بلکہ نیچے کا سرا پیچھے کو مڑا ہوا تھا۔ "ا"

جہاں تک تاریخی شہادت ملتی ہے، خلافت حضرت عثمانؓ تک اس قدیم حیری خط میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ لیکن حضرت علیؓ کی خلافت میں آپؓ کے ایک خاص شاگرد ابو الاسود نے رسمِ خط میں ترمیم کی اور قرآن شریف میں اعراب بھی لگائے۔

اس بارے میں ایک دلچسپ روایت ہے کہ ابو الاسود بصرہ میں تھے کہ انہوں نے ایک عجمی شخص کو قرآن کریم پڑھتے سنا۔ جب وہ شخص اس آیت پر پہنچا کہ اِنَّ اللّٰهَ بَرِیٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُهٗ تو اُس نے رَسُوْلُهٗ کو بجائے زبر کے زیر سے پڑھا۔ تو ابو الاسود سخت برہم ہوئے۔ کیونکہ اعراب کے بدل جانے سے معنی میں زمین و آسمان کا فرق

ہو گیا تھا۔

چنانچہ وہ اُسی وقت زیاد حاکم بصرہ کے پاس گیا۔ اور کہا کہ پہلے میں قرآن شریف پر اعراب لگانے کو بدعت سمجھتا تھا۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ میں اسے فرض سمجھوں۔ مجھے ایک کاتب دیجئے کہ میں قرآن پاک کو لکھوا دوں۔ یہ درخواست منظور ہوئی۔ اور ابوالاسود کے پاس ایک کاتب بھیج دیا گیا۔

ابوالاسود نے کاتب کو اپنے قریب بٹھا کر ہدایت کی کہ اب میں تم کو قرآن مجید لکھواتا ہوں۔ سنو! جس حرف کے ادا کرنے میں میرا مُنہ کھل جائے۔ اُس کے اُوپر تم ایک نقطہ لگاؤ۔ جس حرف میں دونوں لب کناروں سے ملے ہوئے ہوں۔ اور مُنہ کو گول کر کے ادا کروں۔ تو تم اُس کے آگے (دائیں جانب) ایک نقطہ دے دو۔ اور جس حرف کے ادا کرنے میں آواز کا رُخ نیچے کی جانب ہو۔ تو تم اس کے نیچے ایک نقطہ لگاؤ۔ کاتب نے اس پر عمل کیا۔

یہی نقاط تھے جو قرآن شریف میں سَو برس تک اعراب کا کام دیتے رہے۔ اور اُن کی صورت بجائے لکیروں کے نقطوں کی شکل میں رہی۔ پیش بجائے اُوپر کے حرف کے سامنے لگایا جاتا تھا۔ اور موجودہ تنجّی میں تمیز کے لئے ب ت ث پر جو نقطے ہیں۔ وہ زمانہ مابعد کی ایجاد ہیں۔ اور اس کا عام رواج خلیفہ عبدالمالک بن مروان (۹۶ھ) کے عہد سے ہوا ہے۔ اور اس کارِ خیر میں مشہور ظالم حجّاج بن یوسف بھی شریک ہے۔

اسی طرح ابوالاسود نے حضرت علیؓ کی ہدایت کے مطابق عربی علم نحو کے ابتدائی قواعد منضبط کئے۔ اور اس کے بعد اس نامور فاضل عرب کے چاروں* خطّاط شاگردوں نے رسم الخط میں نمایاں اصطلاحات کیں۔ مثلاً مفرد اور زوج نقطے ایجاد کئے۔ اور اسی طرح قرآن شریف کو عجمیوں کیلئے قابل مطالعہ بنایا۔

بنو امیّہ کی دمشق میں حکومت قائم ہونے کے بعد قطبہ نامی ایک کاتب نے اس عہد کا پہلا قرآن شریف لکھا۔ اور عہد خلافت حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے خالد بن ابی الہیّاج نے طلاء کار قرآن مجید برسوں کی محنت سے تیار کیا۔ لیکن خلیفۂ وقت نے قرآن شریف کو بوسہ دے کر واپس کر دیا۔ کیونکہ وہ اس کا صلہ بیت المال پر نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ دوسرا کاتب ابو یحییٰ مالک بن دینار تھا۔ جو اُجرت پر کتابت کرتا تھا۔ اس کے بعد عہدِ عباسیہ میں علوم و فنون کو غیر معمولی ترقی ہوئی۔ اور کتابتِ قرآن مجید کے حیرت انگیز نمونے اب تک ملتے ہیں ✦

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ولادت رسول کریم صلعم سے کچھ عرصہ قبل ابوسفیان کے والد حرب بن امیہ حیرہ سے یہ رسم الخط سیکھ کر آئے اور اپنی اولاد اور خاص احباب کو سکھلایا جس سے یہ خط مکہ معظمہ میں رواج پا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِّ اعلیٰ عبدالمطلب بھی لکھنا جانتے تھے۔ آپکی ایک قلمی دستاویز قرضہ کے متعلق خلیفہ مامون الرشید کے خزانہ میں موجود تھی جو چمڑہ پر لکھی ہوئی تھی۔ مدینہ منوّرہ میں قبیلہ اَوس اور خزرج کے بعض لوگ لکھنا جانتے تھے۔ اور جب اسلام مدینہ منوّرہ میں آیا تو اُنیس بیس کاتب موجود تھے جن میں سعید بن زرارہ۔ منذر بن عمرو۔ زید بن ثابت۔ رافع بن مالک۔ رُسید بن حفیر۔ اَوس بن خولی وغیرہ مشہور ہیں ✦

---

* نصیر بن عاصم۔ یحییٰ بن یعمر۔ میمون بن اقرن۔ عنبسہ بن معدان۔

صوفی عبدالعزیز ایم۔ اے

گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

شاہ امان اللہ خاں سے میں نے پوچھا ایک دن
اے فدائے دینِ احمدؐ۔ اے وطن کے غمگسار

تھا تیرے زیرِ نگیں مدّت سے اِک آزاد ملک
اور حاصل تھا تجھے دُنیا میں جاہ و اقتدار

سیرِ یورپ کے لئے کابل سے جب نکلا تھا تُو
تیرے شوقِ دید میں تھا ایک عالم بے قرار

جن ممالک میں ہُوا تیرا نزُولِ با حشم!
جشن ہوتے تھے تیرے اعزاز میں واں بیشمار

راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے تری شاہ و امیر
میزبانوں میں ترے تھے جارج قیصر اور زار

اَب یہ کیوں بدلے ہیں تیور بخت نے تجھ سے شہا
آگئے ہیں کیوں ترے گردش میں اَب لیل و نہار

میرا اِستفسار سُن کر سسکیاں بھرنے لگا
اور پھر آنکھوں سے اُسکی بندھ گیا اشکوں کا تار

تھام کر زخمی جگر کہنے لگا "وائے نصیب!
کیا کہوں دُنیا میں ہوتی ہے خزاں بعدازِ بہار"

اِس پہ آئی آسماں سے اِک صدائے پُرعتاب
سُن کہ تھا تُو ایک دن ذی شوکت و گردُوں وقار

بمبئی، شام اور یورپ بھی گیا تو بہرِ سیر
مصر و روما، پیرس و لندن بھی دیکھے بار بار

پر بتا رستے میں بیت اللہ پر بھی کی نظر؟
خانۂ محبوب کا بھی دِل میں تھا تیرے وقار؟

جو خُدا کی نعمتوں سے ہو کے مالا مال پھرے
بھول جائے اُسکو وہ کیسے نہ ہو رُسوا و خوار؟؟

اخوند فیاض احمدؒ

یونیورسٹی

(گو میں ماہر تعلیم اور بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں۔ اور نہ مجھے غیر ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ تاہم مجھے ایک سے زائد اسکولوں اور کالجوں میں طالب علم کی حیثیت سے رہنا پڑا ہے۔ میں معلموں اور متعلموں کو دیکھتا رہا ہوں۔ اور مجھے فرائض معلمی ادا کرنے کا موقع بھی ملا ہے۔ باہر کی یونیورسٹیوں کے حالات پڑھے اور سُنے ہیں۔ اور باہر سے ہو آنے والوں کے تأثرات سُن کر اُنہیں سمجھا بھی ہے۔ بحیثیت طالب علم میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ملک میں علم حاصل کرنا دشوار ہے۔ اور معلم ہونے کی حیثیت سے مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ملک کے بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت میں بڑی احتیاط اور کاوش کی ضرورت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں قابل اور محنتی استادوں کا قحط ہے۔ ان حالات میں مَیں اپنے ذہن میں تعلیم کی ترویج و ترقی کے لئے جو تجاویز مرتب کر سکا ہوں۔ وہ پیش خدمت ہیں۔ فیاض احمدؒ)

اسلام نے جو جامع دُعا ہم کو سکھائی ہے۔ وہ ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان ہر حال میں ہدایت اور رہنمائی کا محتاج ہے۔ روحانی اور اخلاقی امور میں ہم کو اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے پاک بندوں کی دی ہوئی تعلیم اور ان کے عملی نمونہ سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ مادی اور جسمانی امور میں ہم ایک دوسرے کے تجربات اور وسعتِ علم سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جیسے بچہ اپنی ماں سے یا انّا سے کھانا، پینا، چلنا اور کپڑے بدلنا سیکھتا ہے۔ اور جہاں چند صاحبِ علم اور تجربہ کار ہستیاں منظم طور پر کم علم اور ناتجربہ کار افراد کو اعلیٰ تعلیم دیں، انگریزی زبان میں اس جگہ کو یونیورسٹی کہتے ہیں اور یہ لفظ ہمارے ملک میں بھی رائج ہو چکا ہے۔ کسی جگہ علم کی ترویج و ترقی کے لئے وہاں یونیورسٹی کا قیام لازمی ہے۔

میرے نزدیک کسی یونیورسٹی کے استحکام، معیار کی بلندی اور مناسب افادیت کا انحصار، مذکورہ ذیل پر ہے:۔

(۱) ملکی حکومت۔ (۲) ملکی عوام۔ (۳) یونیورسٹی کے ارباب۔

مذکورہ بالا میں سے کسی ایک کی کوتاہی یا غفلت یونیورسٹی کے معیار کو گرا دینے کے لئے کافی ہے۔

اب مَیں مختصراً یہ بیان کرتا ہوں کہ میرے خیال میں مذکورہ بالا میں سے ہر ایک پر یونیورسٹی کے لئے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔

۱۔ حکومت

چونکہ ملک میں امنِ عامّہ اور اقتصادی توازن کی ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے۔ اور اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لئے ان دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے یونیورسٹی کی بقا اور ترقی کا انحصار حکومت پر ہے۔ نیز حکومت ملک کی مجلسِ منتظمہ کا نام ہے۔ اور حکومت کے کاروبار کی صحت اور بلندی کے لئے ضروری ہے کہ اس مجلس منتظمہ کے اراکین اعلیٰ ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کے مالک ہوں۔ نیز ملکی عوام اتنے بیدار اور منظم ہوں کہ وہ حکومت کے ساتھ پورا تعاون کریں

اور کسی حلقہ سے ملکی حکومت یا مجلسِ منتظمہ کی رکنیت کے لئے اعلیٰ ذہنی اور دماغی قابلیت کے افراد پیدا کرنا اور وہاں کے عوام کو مناسب طور پر بیدار اور منظم کرنا بنیادی طور پر علمی درسگاہ یا یونیورسٹی کا کام ہے۔ اس لحاظ سے بھی حکومت پر یونیورسٹی کے متعلق کچھ فرائض ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کا ہر خطہ کسی ایک یا مختلف زرعی، معدنی، جغرافیائی۔ تاریخی، صنعتی، تجارتی یا تمدنی خصوصیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ ملک کے کسی خطہ کی خصوصیات کا مطالعہ اور ان سے مناسب طور پر فائدہ اُٹھانے کے ذرائع کے متعلق تحقیقات اور ان خصوصیات کی بقاء وغیرہ کے پروگرام کا اہم حصہ ہونا چاہئیں۔ اور یہ سب کچھ بغیر یونیورسٹی کے قیام کے پُورا نہیں ہو سکتا۔

چونکہ کسی خطہ کی خصوصیات اور وہاں کی یونیورسٹی میں ایک رشتہ ہوتا ہے۔ اس لئے ملک کی ہر یونیورسٹی اپنا ایک امتیاز رکھتی ہے۔ مثلاً زرعی علاقے کی یونیورسٹی کے دارالعمل میں نئی نئی زرعی ضروریات کے پیشِ نظر زراعت کے متعلق زیادہ تجربات کرنے پڑیں گے۔ اور لازماً اس یونیورسٹی کا عملہ زیادہ تر ماہرینِ زراعت پر مشتمل ہوگا۔ اور طلباء بھی زیادہ تر علمِ زراعت کے ہوں گے۔ اسی طرح صنعتی خطوں میں صنعتی یونیورسٹیاں، اور جنگلات، آبشاروں یا پہاڑوں کے قریب کے علاقوں میں وہاں کے قدرتی ذرائع کے مطابق یونیورسٹیاں قائم ہونگی۔ یا کسی تاریخی یا آثارِ قدیمہ کے لحاظ سے اہم علاقہ کی یونیورسٹی کا امتیاز یہ ہوگا کہ وہ آثارِ قدیمہ کے ماہرین پیدا کرے۔ کیونکہ وہاں اس علم کو آزمانے اور اس میں پختگی حاصل کرنے کے ذرائع وسیع اور سہل الحصول ہوتے ہیں۔

میرے نزدیک یہ امتیاز یونیورسٹی کی جان ہے۔ اور یونیورسٹی کے جسم اور اسکی جان کے تعلق کا دیرپا اور مستحکم ہونا زیادہ تر حکومت کی محتاط روش پر منحصر ہے۔

تمہید بالا کے بعد ملکی حالات کے پیشِ نظر جس اہم ترین مقصد کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ حکومت ملک میں زیادہ سے زیادہ یونیورسٹیوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کرے۔ تاکہ ملک کے مختلف طبقوں اور علاقوں کی ضرورت کے مطابق یونیورسٹیوں کی معقول تعداد پائی جائے۔

ایک ترقی پسند یا ترقی یافتہ ملک میں وفاقی (فیڈرل) یونیورسٹیوں کی ضرورت ہے۔ ایک فیڈرل یونیورسٹی ملکی ترقی کا آئینہ ہوتی ہے۔ مگر بایں ہمہ ملک کے مختلف گوشوں میں چھوٹی یونیورسٹیوں کی ضرورت بدستور قائم رہتی ہے جو ماحول کی مناسبت اور اپنے امتیاز کے لحاظ سے خاص علوم وفنون کے ماہر اپنے ملک کے لئے پیدا کرتی رہیں۔

یہ بھی درست ہے کہ ملک کے ہر خطہ میں یونیورسٹیوں کے قیام کی ذمہ داری صرف حکومت پر نہیں۔ حکومت تمام ملک میں اس حد تک تعلیم کی ذمہ دار ہے کہ ناخواندگی نہ رہے۔ یونیورسٹی کا مقصد اعلیٰ تعلیم دینا ہوتا ہے۔ بہت سی یونیورسٹیوں کے قیام میں عوام کا دخل زیادہ ہونا چاہیئے۔ اور حکومت کو مختلف علاقوں اور جماعتوں کی ضرورت کے مطابق یونیورسٹیوں کے قیام کی پُوری حمایت اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

ملک میں بہت سی یونیورسٹیوں کے قیام کا صرف یہی فائدہ نہیں ہوگا۔ کہ وہ ملک میں ہر جگہ اپنے اپنے ماحول کے تقاضوں کو پُورا کر رہی ہونگی۔ بلکہ اور اہم فوائد بھی حاصل ہوں گے۔ جو مختصراً عرض کرتا ہوں:-

۱- متعدد یونیورسٹیوں کی موجودگی سے مقابلے کی رُوح پیدا ہوگی۔ طلباء اور اساتذہ کو ترقی کی منازل جلد جلد طے کرنے کی تحریک ہوگی۔ جس کے نتیجہ میں ملک میں ماہرین کی کثرت ہوگی۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہر قسم کے داخلی اور خارجی مسائل میں ملک کی رہنمائی کرنے والے اور ملکی حکومت کو مشورہ دینے والے اہل افراد کی کمی نہ رہیگی۔ اور قوم اپنے بُرے بھلے کو خود سوچنے اور اپنی تجاویز کو بہتر اور محفوظ طور پر عملی جامہ پہنانے کے قابل ہو جائے گی۔ دُوسرے چونکہ ملک میں یونیورسٹیوں کی کثرت ہوگی اور

ہر یونیورسٹی کے سامنے اپنا دائرہ وسیع کرنے کا کوئی نہ کوئی پروگرام ہوگا۔ اس لئے ملک میں ہر فن کے ماہروں کو کام بھی ملتا رہیگا۔ پس نہ صرف یہ کہ اعلیٰ دماغ آگے آتے رہیں گے۔ بلکہ ان کی بیکاری کا بھی سدِ باب ہوتا رہیگا۔ اور ان کی نشو و نما اور ترقی کے مواقع موجود ہوں گے۔ اس کے علاوہ ماہرین کی کثرت غیر پیشہ ور سائنس دان پیدا کرے گی۔ سائنسی تحقیق (ریسرچ) اور ملک کی فنی اور ثقافتی ترقی کے لئے غیر پیشہ ور ماہرین کی ضرورت اور اہمیت بالکل اسی طرح ہے جیسے بھوکے کے لئے کھانا۔

۲۔ فی زمانہ مادی ترقی کے لئے سائنسی ریسرچ واحد زینہ ہے۔ سائنسی تحقیق کی دو قسمیں ہیں۔ اساسی اور صنعتی۔ اساسی تحقیق وہ جس کے نتیجہ میں خالص سائنسی علوم کی تدوین ہوتی ہے۔ اور صنعتی تحقیق وہ جس کے نتیجہ میں ان علوم کو صنعت جاری کرنے اور صنعت کو ترقی دینے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ سائنس ہی صنعتی ترقی کی بنیاد ہے۔ پس ہمارے لئے ترقی کا ذریعہ صرف صنعتی تحقیق ہی نہیں۔ بلکہ اگر ہم دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں پہنچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اساسی تحقیق یا خالص علوم میں بھی تحقیق کی ضرورت ہے۔ اور اس کا ثبوت دینے کی ضرورت نہیں کہ اساسی تحقیق کے لئے یونیورسٹی ہی اوّلین اور بہترین جگہ ہے۔ اور ان مختلف علوم میں تحقیق کے لئے صرف زیادہ تحقیق گاہوں کی کمی ہی نہیں بلکہ ان علوم کے مطابق ماحول کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے اگر ملک کے مختلف خطوں میں اپنے ماحول کے لحاظ سے مختلف علوم میں اعلیٰ تربیت دینے والی یونیورسٹیاں موجود ہوں گی۔ تو وہ اساسی تحقیق کا بوجھ اٹھالیں گی۔

۳۔ یہ فائدہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ ملک میں بہت سی یونیورسٹیوں کی موجودگی کے نتیجہ میں علم سکھانے والوں اور علم سیکھنے والوں کے لئے اپنے اپنے مقصد کے پیشِ نظر اپنے ذوق اور اپنی قابلیت کے اعتبار سے مناسب مقام حاصل کر لینا آسان ہوگا اور مطمئن استاد اور مطمئن شاگرد صرف علمی ترقی کا باعث ہی نہیں بلکہ ملک بھر میں تمدنی اور اخلاقی ترقی کا موجب بھی ہوں گے۔

یہاں پر حکومت کے راستہ میں دو مشکلات کا ذکر اور اپنے نزدیک ان کا حل پیش کر دینا خالی از مفاد نہ ہوگا۔

(۱) پہلی مشکل تو ملک کے مختلف حصوں میں بہت سی یونیورسٹیوں کا فوری قیام ہے۔ اس کے متعلق پہلے میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ بہت سی یونیورسٹیوں کا قیام میرے نزدیک صرف حکومت کے ذمہ نہیں۔ بلکہ عوام اس ذمہ داری میں زیادہ شریک ہیں۔ حکومت کو زیادہ سے زیادہ یونیورسٹیوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ اور حکومت اپنی اس پالیسی کا اظہار مختلف صورتوں میں کر سکتی ہے۔ یونیورسٹی کے قیام سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ مجوزہ یونیورسٹی کا خصوصی امتیاز کیا ہے؟ اور اس امتیاز اور یونیورسٹی کے محلِ وقوع میں کیا مناسبت ہے؟

(۲) دوسرے درجے پر مختلف یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کا مسئلہ ہے۔ میرے نزدیک حکومت اور عوامی اداروں کو کسی یونیورسٹی کے معیار اور اس کے طریقۂ تعلیم کو مدِ نظر رکھ کر اس کی ڈگری کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ مثلاً اگر ایک یونیورسٹی کا معیار اور طریقۂ تعلیم ایسا ہے کہ اس کا گریجویٹ اعلیٰ انتظامی قابلیت حاصل کر لیتا ہے۔ مگر دوسری یونیورسٹی کا گریجویٹ ادنیٰ انتظامی قابلیت رکھتا ہے۔ تو اوّل الذکر کی ڈگری کو اعلیٰ انتظامی عہدوں اور مؤخر الذکر کی ڈگری کو اس سے ادنیٰ عہدوں کے لئے تسلیم کرنا چاہیئے۔

(باقی)

ملک ن۔ ا۔ ریاض

صدرِ اسلام کا ایک تاریخی افسانہ

لشکرِ اسلام کے فتح نصیب جرنیل حضرت "خالدؓ بن ولید" قلعہ دمشق کا محاصرہ کیے بلائے ناگہانی کی طرح دمشقیوں پر مسلط ہیں۔ باہمی آویزش کے اس مدّ و جزر میں متواتر بیس روز کا عرصہ گزر گیا لیکن اہلِ دمشق نے ہمت نہ ہاری اور کمک کی اُمید کے سہارے ڈٹے رہے۔

حضرت خالدؓ یوں بے مصرف وقت ضائع ہوتا دیکھ کر اُکتا سے گئے۔ اور ایک فیصلہ کن حملہ کی ٹھانی۔ چنانچہ دو تین روز تک دونوں طرف سے نہایت شدّت کے ساتھ لڑائی ہوتی رہی جس سے اہلِ دمشق گھبرا گئے۔ کیونکہ جس کمک کی اُمید پر وہ اڈے بیٹھے تھے۔ جب اس کی کوئی بھی جھلک نظر نہ آئی۔ تو آخر تنگ آکر انہوں نے ایک آدمی کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ ہم ایک مقررہ رقم دینے پر تیار ہیں۔ بشرطیکہ تم وہ رقم لے کر ہمارا محاصرہ چھوڑ دو۔ اور پھر کبھی اِدھر کا رُخ نہ کرو۔ سپہ سالار اسلام (حضرت خالدؓ) نے کہلا بھیجا کہ جبتک تم مستقل طور پر ہماری حفاظت میں آنا قبول نہ کرو۔ اور ہر سال جذیہ دینے کی ذمہ داری نہ اُٹھاؤ اُس وقت تک محاصرہ چھوڑنا ناممکن ہے۔ یہ جواب سُنکر اہلِ دمشق بے حد مایوس ہوئے۔ لیکن بایں ہمہ اہلِ اسلام کی حفاظت میں آنا منظور نہ کیا۔ اور بدستور قلعہ بند رہے۔

ایک روز اچانک قلعہ کے اندر مسرّت کے قہقہے بلند ہوئے اور رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہونے کی بے ہنگم آوازیں سُنائی دیں۔ حضرت خالدؓ نے اس بے موقعہ خوشی کا باعث معلوم کرنیکے لئے تحقیقات کی تو پتہ چلا کہ رُومیوں کا ایک بڑا لشکر اہلِ دمشق کی مدد کو آرہا ہے۔ حضرت خالدؓ نے نزاکتِ وقت کے مدِّ نظر یہی بہتر سمجھا کہ حضرت "ضرارؓ" جیسے سرفروش جانباز کو پانچ سو سوار دے کر کمک کو روکنے کے لئے بھیجا جائے۔ چنانچہ حضرت ضرارؓ سپہ سالارِ اسلام کے حکم کو بسر و چشم قبول کرتے ہوئے یُوں گویا ہوئے :۔

ضرارؓ :۔ سپہ سالار محترم! پانچ سو جوانوں کے لے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مجھے حکم دیجئے تو میں تنہا ہی دشمن کے مقابلہ کے لئے تیار ہوں۔

سپہ سالارِ اسلام :۔ مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ تم اس شجاع قوم کے قابلِ فخر جوان ہو جن کی عورتوں کی بہادری کی داستانیں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ لیکن خدا کا حکم ہے کہ اپنی جان کو دیدہ دانستہ ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اس لئے پانچ سو چیدہ، غیور اور بہادر مجاہدین کو ہمراہ لے جاؤ۔ اور جان توڑ کر لڑو۔ لیکن ہاں اگر اُن کے مقابلہ کی سکت نہ پاؤ تو مجاہدین سمیت واپس آکر مجھے اطلاع دو۔

جب حضرت ضرارؓ مجاہدین کو ہمراہ لئے کچھ فاصلہ طے کر چکے تو انہیں دُور سے رُومی لشکر کا غبار دکھائی دیا۔ اُنکی خودوں اور زرہوں کی خیرہ کن چمک، اُن کی زرق برق وردیاں اور ظاہری طمطراق ایک عجیب ہولناک منظر پیش کر رہا تھا جس پر لشکرِ اسلام میں

خیال آرائیاں ہونے لگیں۔

چند سوار (ضرارؓ سے) ہمارے خیال میں یہ لشکر اندازاً دس بارہ ہزار سے کم نہیں۔ پھر ان کے پاس سامانِ حرب بھی بے انداز نظر آتا ہے۔ ہم اس بے سروسامانی میں اُن سے کیونکر اُلجھ سکیں گے۔ بہتر ہو کہ واپس لوٹ چلیں۔

ضرارؓ:۔ خدائے ذوالجلال کی قسم میں دشمن سے ضرور نبرد آزما ہونگا۔ خدا مجھے دشمن سے پیٹھ پھیرنے کی توفیق نہ دے کیونکہ جو میدانِ جنگ سے بھاگتا ہے وہ خدا کا نافرمان ہے۔ تم میں سے جس کا جی چاہے وہ شوق سے واپس چلا جائے میں تو اپنی جان کی بازی اس کی راہ میں ہار چکا ہوں۔

رافع بن عمیرؓ:۔ ضرارؓ سچ کہتے ہیں کہ تمہیں ہمت نہ ہارنی چاہیئے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ہماری قلیل جماعت کو دشمن کی کثرت پر غالب کیا ہے۔ جب خدا ہمارے ساتھ ہے تو دشمنوں کی کثرت کا کیا ڈر۔ خدائے ذوالجلال سے صبر و ثبات کی دُعا مانگتے ہوئے بھوکے شیروں کی طرح رومیوں پہ پل پڑو۔ اور یہ یقین کرلو کہ خدا اور اس کا رسول (صلعم) تمہیں دیکھ رہے ہیں۔

رافع بن عمیرؓ کے ان الفاظ نے بجلی کا سا کام کیا۔ اور سب مجاہدین انتہائی جوش کے عالم میں یکزبان ہو کر پکار اُٹھے۔

"خدا ہم کو کبھی اپنی راہ سے بھاگتے نہ دیکھے۔ اور ہمیں جنت کا وارث بنائے"

یہ منظر دیکھ کر حضرت ضرارؓ کے دل کی پژمردہ کلی کھل گئی اور مجاہدین سے کہا۔ اچھا اب ایک قطار میں کھڑے ہو کر اپنے نیزوں کو سیدھا تان لو۔ دشمن اطمینان سے کوچ کئے آرہا ہے۔ جب تمہیں پیشرو دستہ دکھائی دے تو اُس پر ٹوٹ پڑو۔ اور ضرارؓ خود اپنا کرتہ اُتار ننگے بدن گھوڑے پر سوار ہو کر ہاتھ میں ایک لمبا سا نیزہ لئے ہوئے تیار ہو ہی رہے تھے کہ پیشرو دستہ نظر آیا۔ ضرارؓ اپنے ہمراہیوں سمیت اللہ اکبر کے فلک بوس نعروں کی ایمان پرور گونج میں رومی لشکر پر جھپٹ پڑے۔ پھر کیا تھا۔ اپنے منجھے ہوئے ہاتھوں سے وہ بچھے تلے وار کئے کہ رومی دستہ اس کی تاب نہ لاکر بھاگ نکلا۔ اور باقی لشکر سے جا ملا۔ مجاہدین اسلام انکا تعاقب کئے وہاں بھی جا پہنچے اور تمام لشکر پر ہلہ بولدیا۔ حضرت ضرارؓ کی کیا بات تھی دفعتہً بجلی کی طرح رومیوں کے قلب میں گھس جاتا اور کئی ایک کو موت کے گھاٹ اُتار کر فوراً نکل آتے اُن کے رفقاء بھی بڑھ بڑھ کر دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ رومی اس تیغزنی سے بوکھلا سے گئے۔ اُنہوں نے ہر چند اپنی پوری قوت کے ساتھ یورش کر کے ضرارؓ کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کوندے کی طرح لپک کر باہر آجاتے۔ اچانک ضرار کی نظر رومی سردار وردان پر پڑی۔ وہ اُس کی طرف لپکے۔ لیکن اُس کے بیٹے حمران نے موقع پاکر ضرار پر نیزہ کا وار کیا جو اُن کے بازو میں لگا۔ لیکن ضرار نے اسی حالت میں فوراً سنبھل کر زور سے حمران کو نیزہ مارا جو اُس کے سینہ میں لگا۔ ضرارؓ نے جھٹکا دیکر نیزہ کھینچنا چاہا لیکن اُس کا پھل کچھ اس طرح حمران کے سینہ میں پیوست ہو کر رہ گیا تھا کہ نکل نہ سکا۔ اور حمران گھوڑے سے نیچے آرہا۔ ضرارؓ زخموں کے ضعف اور کفار کے ہجوم سے بے بس ہو کر گرفتار ہو گئے۔

حضرت خالدؓ کو جب ضرارؓ جیسے جان نثار اور بہادر جنگجو کی گرفتاری کی اطلاع پہنچی تو آپ کو بے حد قلق ہوا۔ اور اُسی وقت "میسرہ بن مسروق" کو ایک ہزار مجاہدین دے کر دمشق کے شرقی دروازہ پر محاصرہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اور باقی لشکر رجز پڑھتے ہوئے دشمن کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ اسی لمحہ آنِ واحد میں انہوں نے کیا دیکھا کہ ایک زرہ پوش سوار بلند قامت کمیت گھوڑے پر سوار اُن کے پاس سے نکل گیا۔ سب حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگے کہ آخر یہ سوار ہے کون

جو سرفروشانِ اسلام کی امداد کے لئے اُن سے آگے آگے جا رہا ہے۔ چال ڈھال سے پُھرتی اور شہسواری کے انداز نظر آئے زرہ سیاہ لباس سے ملفوف اور آنکھوں کے سوا باقی تمام چہرہ پوشیدہ۔ جب دونوں فوجیں آپس میں گتھ گئیں تو خالدؓ یہ دیکھکر ششدر رہ گئے کہ وہی نقاب پوش سوار ایک دم رومی لشکر پہ جھپٹا اور اپنی فقید المثال تیغزنی سے ایک قیامت برپا کر دی۔ اس کی بے باکی، شجاعت اور حملہ کی شدّت دیکھکر سبھی عش عش کر اُٹھے۔ کئی دفعہ اُسے رومیوں نے گھیرا۔ لیکن وہ ہر دفعہ کچھ اس طرح صاف بچ کر نکل آتا کہ بے ساختہ داد دینا پڑتی۔ جدھر رُخ کرتا اُس کی شمشیر خارا شگاف پیغام اجل لئے دشمنوں کو ابدی نیند سلائے بغیر نہ رہتی۔

مجاہدین میں سے گو ہر ایک نے ہی جان کی بازی لگا دینے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ لیکن اس سوار کی شان ہی نرالی تھی۔ حضرت خالدؓ اس کی سلامتی کے لئے دُعا کر رہے تھے اور بار بار رفقاء سے پُوچھ رہے تھے کہ یہ بہادر شہسوار ہے کون۔ لیکن کوئی بھی اس سے واقف نہ تھا۔ اتنے میں وہی نقاب پوش سوار رومی لشکر کے قلب سے خون میں نہاتا ہوا نکلا۔ اس کے گھوڑے کا تمام جسم بھی زخموں سے لہولہان ہو رہا تھا۔ حضرت خالدؓ نے حکم دیا کہ اس مردِ مجاہد کی مدد کو پہنچو۔ مجاہدین نے انتہائی جوش میں نئے سرے سے رومیوں پر ہلّہ بول دیا۔ رومیوں نے ہر چند لشکر کو سنبھالنا چاہا لیکن نہ سنبھلا۔ آخر رومی پسپا ہونے لگے۔ اور میدان اہلِ اسلام کے ہاتھ رہا۔ حضرت خالدؓ کو رہ رہ کر اس بہادر سوار کا حال معلوم کرنے کا شوق ستا رہا تھا۔ چنانچہ آپ اس کے پاس پہنچے اور فرمایا۔

خالدؓ :۔ اے غازیٔ اسلام خدا تجھے جزائے خیر دے تو نے جہاد کا حق ادا کر دیا۔ اب ذرا مُنہ سے نقاب ہٹا دے۔ تاہم کو بھی معلوم ہو کہ تُو کون ہے۔ اور تیری زیارت سے دیدہ و دل روشن کریں۔

نقاب پوش سوار :۔ مکمل خاموشی . . . . . .

ایک مجاہد :۔ اے بہادر سوار تیرا سردار تجھ سے مخاطب ہے۔ تیرا اس وقت سکوت فوجی آئین کے خلاف ہے۔

نقاب پوش سوار :۔ (اپنی نازک اور دلکش نسوانی آواز میں) اے سپہ سالارِ اسلام میری خاموشی کسی آئین کی خلاف ورزی کی نیّت سے نہیں صرف شرم و حیاء کے باعث ہے۔ کیونکہ مَیں دُکھیاری پردے میں بیٹھنے والی عورت ہوں۔

خالدؓ :۔ (متعجب ہو کر) تیرا نام کیا ہے۔ اور تُو کس قوم سے ہے۔

نقاب پوش سوار :۔ میرا نام خولہ ہے اور میں ضرار کی حقیقی بہن ہوں۔ مَیں دُوسری عورتوں کے ہمراہ خیمہ میں بیٹھی تھی کہ مجھے ضرار کی گرفتاری کی خبر سُنائی دی۔ چنانچہ خون کے جوش میں مجھے کچھ بھی نہ سُوجھا اور بیقرار ہو کر کفّار سے انتقام لینے اور بھائی کو رہا کرانے کے لئے جہاد میں مصروف ہو گئی۔ سپہ سالار! آپ جانتے ہیں کہ اگر شوہر مارا جائے تو اس سے اچھا شوہر بھی مل جانا ممکن ہے۔ اگر اولاد مر جائے تو اور اولاد بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایسا پیارا اور جنگجو بھائی ملنا مشکل ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ مَیں کفّار سے لڑتے لڑتے شہید ہو جاؤں۔

خالدؓ :۔ خولہ جس قوم کی تم بیٹی ہو۔ اس سے اس قسم کی شجاعت کچھ زیادہ حیران کن نہیں۔ کیونکہ تمہاری قوم کی عورتیں بہادری میں ضرب المثل ہیں۔ جو مَردوں کے دوش بدوش لڑ کر دادِ شجاعت حاصل کرتی رہی ہیں۔ تم اطمینان رکھو۔ مجھے تمہارے بھائی کا بڑا رنج ہے۔ اگر ضرار زندہ ہے تو مَیں اُسے ضرور چھڑا لاؤنگا۔ اور اگر شہید

ہو چکا ہے تو میں بھی نہ جیوں گا جب تک رومیوں سے اس کا بدلہ نہ لے لوں۔ تم اب عورتوں میں جا کر آرام کرو۔

خولہ:۔ سپہ سالار محترم! خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ لیکن کیا مجھے آپ کے ہمرکاب رہنے کی اجازت ہے۔

خالدؓ:۔ ہاں اجازت ہے۔

اب حضرت خالدؓ نے مجاہدینِ اسلام کو ہمراہ لے کر رومیوں پر ایک خطرناک حملہ کر دیا۔ خولہؓ حضرت خالدؓ کے پہلو بہ پہلو کفار کے لئے بلائے بے درماں بنی ہوئی انہیں موت کے گھاٹ اتار رہی تھیں۔ اور حضرت خالدؓ کی تلوار جدھر اٹھتی تھی۔ صفوں کو چیرتی ہوئی تباہی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اور کفار اوندھے منہ خون سے لت پت اپنی بربادی کی داستان کہہ رہے تھے۔ خولہؓ وارفتگی کے عالم میں بے تحاشا رومیوں کے لشکر میں گھس جاتیں اور انتہائی بے تابی کے ساتھ یہ اشعار پڑھتیں:۔

ابن الضرار لا اراہ یومی ✤ ولا یری معشری و قومی

یا واحدی یا ابن امی ✤ کدرت عیشی وازلت نومی

''یعنی اے ضرار تو کہاں ہے۔ میری اشکبار آنکھیں آج تیری دید کی پیاسی ہیں۔ تو تو میرے اقرباء اور میری قوم کی نظروں سے بھی اوجھل ہے۔ میرے اکلوتے بھیّا۔ میرے ماں جائے تو نے میرا عیش و آرام مکدر کر دیا۔ اور میری نیند مجھ سے چھین لی''

خولہؓ کے پُر درد اشعار سے مسلمانوں کے سینے چھلنی ہوتے جاتے تھے۔ حضرت خالدؓ خولہؓ کی یہ دیوانگی دیکھ کر بیقرار ہو گئے۔ اور ضرارؓ کا پتہ لگانے کے لئے سرگرداں نظر آنے لگے۔

جب لڑائی ذرا تھمی اور رومی اپنی قیامگاہ پر پہنچے تو بعض ان میں سے مجاہدینِ اسلام کے جان سوز حملوں سے گھبرا کر بھاگنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر وردان نے ان کو قتل کی دھمکی دی۔ اور ان کی جائداد وغیرہ کے ضبط کر لینے کا خوف دلایا۔ انہوں نے کہا۔ ہم اہلِ عرب کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ وہ ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر ڈالتے ہیں۔ ہم ان سے سخت مرعوب ہو چکے ہیں۔'' وردان'' نے کہا۔ گھبراؤ مت آج تو اچانک مڈ بھیڑ ہو گئی تھی۔ کل ہم مکمل تیاری کے ساتھ ان کی خبر لیں گے۔ مجھے تو ابھی اپنے بیٹے کا بدلہ بھی ان سے لینا ہے۔ جب تک میں تمام عربی لشکر کو تہِ تیغ نہ کر لونگا چین نہ آئیگا۔

اس طرح بعض تو وردان کی دھمکی سے مرعوب ہو گئے۔ لیکن چند سواروں نے یہ دل میں ٹھان لی کہ لشکرِ عرب میں جا کر پناہ گزین ہو جائیں اور ان سے جان و مال کی امان چاہیں۔ چنانچہ وہ کسی بہانے اپنے لشکر سے نکل کر اسلامی کیمپ میں جا پہنچے۔ مسلمان پہرہ داروں نے ان کو دیکھ کر اپنی تلواریں سونت لیں۔ لیکن رومی سواروں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

مسلمان پہرہ دار:۔ تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔

رومی سوار:۔ ہم رومی لشکر سے بھاگ کر آئے ہیں اور امان چاہتے ہیں۔ ہم کو اپنے سردار کے پاس لے چلو۔

جب مسلمان پہرہ دار انکو حضرت خالدؓ بن ولید سپہ سالارِ اسلام کے پاس لے کر پہنچے تو وہ بے ساختہ پکار اٹھے ہمیں امان دیجئے اور اپنی حفاظت میں لے لیجئے۔

سپہ سالارِ اسلام:۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو۔

رومی سوار:۔ ہم "حمص" کے رہنے والے ہیں جہاں کا حاکم "وردان" ہے۔

سپہ سالارِ اسلام:۔ جب ہم تمہارے شہر میں پہنچیں گے تو پھر تم سے صلح کی بات چیت ہوگی۔ ابھی تم احتیاطاً ہماری نظر بندی میں رہو لیکن ہاں یہ تو بتاؤ آج ہمارا ایک بہادر سوار رومیوں نے گرفتار کر لیا تھا۔ اُس کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا تھا؟

رومی سوار:۔ (استفسارانہ لہجہ میں) کیا وہ سوار جس نے "وردان" کے بیٹے کو قتل کیا تھا۔

سپہ سالارِ اسلام:۔ ہاں ہاں وہی بہادر "ضرارؓ"۔

رومی سوار:۔ (نے کہا) جب وہ گرفتار ہوا تھا تو "وردان" نے اس کو ایک دستہ سواروں کے ہمراہ بادشاہِ روم کے پاس بھیجدیا تھا تاکہ وہ اپنی شجاعت اور بہادری کا بادشاہ کے سامنے اظہار کرے۔

یہ سنتے ہی حضرت خالدؓ نے رافع بن عمیرہؓ کو کہا۔ تم ابھی ایک سو سوار لے کر ہوا ہو جاؤ۔ اور ضرارؓ کو چھڑا لاؤ۔ رومی اونٹوں پر سوار ہیں تم بہت جلد انکو راستہ میں ہی پکڑ لوگے۔ خولہؓ فرطِ جوش میں بول اٹھیں۔ سپہ سالار محترم مجھے بھی اجازت دیجئے کہ میں بھی اُن کے ہمراہ جاؤں اور اپنے بھائی کے چھڑانے میں ان کو مدد دوں۔ حضرت خالدؓ نے خولہؓ کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور اجازت دے دی۔ اور رافع کو بہت جلد جانے کی تاکید کی تاوہ دور نہ نکل جائیں۔ جب رافع بن عمیرہ تین میل کا فاصلہ طے کر چکے تو انہیں ستر سوار دکھائی دئے۔ ضرارؓ اس وقت نہایت رقت آمیز لہجہ میں یہ اشعار پڑھ رہے تھے:۔

الا مُبلغاً قومی و خولۃ انّنی ❊ اسیرٌ موثق الیدِ بالقیدِ

وحولی علوجُ الشام من کلّ کافرٍ ❊ وما منھم الّا محصن بالسّندِ

فیا قلب مُت غمّاً وحزناً وحسرۃً ❊ ویا دمع جودی بفیضٍ علی خدٍّ

اتری ان اری اھلی وخولۃ مرۃً ❊ واذکرما تنّا علیہ من العھدِ

"یعنی اے خبر پہنچانے والے میری قوم کو اور خولہؓ کو بتادے کہ میں قید میں بے حد کس مپرسی کی حالت میں جکڑا پڑا ہوں۔ میرے گرد شامی کافر زرہوں میں ملبوس کیل کانٹے سے لیس موجود ہیں۔ پس اے دل آفرین ہے تجھ پر کہ تو اس قدر بے پناہ غم والم کے باوجود اتنی حسرت برداشت کر رہا ہے۔ اے آنسو جوانمردی دکھا اور ڈھل کر میرے رخسار پر جاری ہو جا۔ کیا تو چاہتا ہے کہ میں ایک بار اپنے اقرباء اور خولہؓ کو دیکھ لوں اور اپنا دُکھڑا سناؤں"!

خولہؓ نے جب یہ اشعار سنے تو بے قرار ہو کر پکار اٹھی۔ میرے پیارے بھیا میں آگئی۔ یہ کہہ کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا، اور مجاہدوں کے ہمراہ رومیوں پر زخمی شیرنی کی طرح جھپٹی۔ ایک ایک مجاہد نے ایک ایک رومی کو تاکا اور سب کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ پھر ضرارؓ کی مشکیں کھولیں جن کو ایک اونٹ پر لادا ہوا تھا۔ ضرارؓ خولہؓ کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے چلا اٹھے۔ اور خولہؓ اپنے محبوب اور بہادر بھائی کو پاکر خدائے عزّوجل کا شکر بجالائی اور وہ خوش و خرم حضرت خالدؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

رشید قیصرانی

سُرخ سیلاب

سُرخ سیلاب کی موجوں سے بہلنے والو
یہ کہیں عظمتِ انسان کا ہی خون نہ ہو
جس کی پرواز نے تاروں پہ کمندیں ڈالیں
وہ تمہارے ہی پر و بال کا مرہون نہ ہو

تم پرستار ہو جن "سُرخ خداوندوں" کے
وہ تمہارے ہی کہیں خون کے پیاسے تو نہیں
جن کو پیغامِ سکوں تم نے سمجھ رکھا ہے،
کسی پُرکار کے رنگین دلاسے تو نہیں!

نوکِ سنگین پہ جب ہوتا ہے مظلوم کا سر
تم اسے سُرخ پھریرے کا لقب دیتے ہو
مطلعِ چین سے پھوٹے ہیں لہو کے دھارے
تم اسے سُرخ سویرے کا لقب دیتے ہو

ہاں اسی سُرخ سویرے کی ضیاؤں کے طفیل
دامنِ چرخ سے انمول ستارے ٹوٹے
تم نے نادار کی غربت کا سہارا لے کر
کتنے مجبور عقائد کے خزینے لوٹے!

تم ہی سُلگاتے ہو اس دور میں افلاس کی آگ
تم ہی اس آگ کے شعلوں کو ہوا دیتے ہو
منعقد کرتے ہو پھر سُرخ شیاطین کا رقص!
اور ایمان کی قندیل بجھا دیتے ہو

جسمِ گیتی پہ ہو تم ایک بھیانک ناسور!
جس سے رستا ہی ابھی عصمتِ احساس کا خوں
اس کے ہر ریشے سے تم بُنتے ہو سُرخ اجنبی جال
اب بھی میں تم کو جفاکار کہوں یا نہ کہوں؟

(ماخوذ از روزنامہ "الفضل")

محمد اسلم چوہان

شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ

آج مسلمانانِ عالم ایک ایسے دور میں سے گزر رہے ہیں کہ طویل عرصہ کے تنزل اور ادبار کے بعد اُن کے پھر اُبھر آنے اور ترقی کرنے کے مواقع پیدا ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے جیسے اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو دُنیا کے امن اور صلح کے قیام کا علمبردار بنا کر آج پھر دُنیا کی راہنمائی اور سرداری کا وہ مقام عطا کرنا چاہتا ہے۔ جو دنیا کی کسی قوم کو آج تک عطا نہیں ہوا۔ اللہ تعالےٰ کا یہ ارادہ علاوہ اُن پیشگوئیوں کے جو آخری زمانہ میں مسلمانوں کی دوبارہ ترقی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ آج مسلمانوں میں ترقی اور تنظیم کے اس عالمگیر احساس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ جو مستقبل قریب میں عظیم الشان نتائج کا پیش خیمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آج مسلمانانِ عالم میں اس شدت کے ساتھ یہ احساس پیدا ہو جانا دراصل اسلام دشمنی کے اس جذبہ کا طبعی نتیجہ ہے جس کا مظاہرہ گذشتہ دو سو سال میں دُنیا کی برسرِ اقتدار قوموں کی طرف سے کئی بار کیا جا چکا ہے۔ آج بھی امریکی برطانوی اتحاد اور رُوسی بلاک دونوں مسلم دنیا کو حریص نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ امریکی برطانوی اتحاد اُن متعصب خیال عیسائی اقوام کی نمائندگی کرتا ہے جو کسی زمانہ میں اسلام کی عظمت و اقتدار کے سامنے سرنگوں ہونے کی خفت اور ذلت کا انتقام لینے پر اُدھار کھائے بیٹھی ہیں۔ وہ آج بھی دنیا میں مسلمانوں کے وجود کو اپنے لئے مستقل خطرہ محسوس کرتی اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے ناپید کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف نظر آتی ہیں۔ دُوسری طرف روسی بلاک مذہب کی مخالفت کے اس جنون کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس کے بغیر اس بلاک کی ترقی شیخ چلی کا خواب بن کر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا خدا کے نام کو دُنیا میں بلند کرنے کی ہر خواہش (جو عملاً آج مسلمانوں میں ہی پائی جاتی ہے) کی مخالفت کرنا اس بلاک کا مقصدِ وحید قرار پایا۔ چنانچہ علاوہ دیگر سیاسی وجوہ کے خدا دشمنی کی بناء پر بھی روس مسلمانوں کا دوست نہیں بن سکتا۔

دنیا کے ممالک کی یہی وہ روش ہے جو آج دُنیا کے مسلمانوں کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر کے اس کو استحکام جیسے اہم ترین فریضہ کی طرف توجہ دلانے کا موجب بن رہی ہے۔ لیکن اِس نازک وقت میں اس احساس سے عدم توجہی یا اس کا غلط استعمال نہ صرف یہ کہ اچھے نتائج پیدا کرنے سے یکسر قاصر رہیگا۔ بلکہ وقت گذر جانے پر ایک لمبے عرصہ کے لئے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا موجب بھی بن جائیگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس ہمہ گیر احساس سے مناسب وقت پر فائدہ اُٹھا کر دُنیا کے مسلمان ایسی تدابیر اختیار کریں جو اُن کے لئے کسی سُنہرے مستقبل کا پیش خیمہ بن کر اسلام کی عظمت و شوکت کو دُنیا میں دوبارہ قائم کرنے کا باعث بن سکیں۔ بلکہ اس سے بھی پہلے ضروری ہوگا کہ ہم اُن اسباب پر نگاہ ڈالیں جو گذشتہ زمانے میں مسلمانوں کی پستی کا موجب بنے۔ تاکہ اگر ایک طرف ہم اُن غلطیوں کو دُہرانے سے بچ جائیں۔ تو دوسری طرف اُن اسباب کی روشنی میں ہم ایسے ذرائع بروئے کار لانے کی سعی کے قابل بن سکیں جو ہماری ترقی کے لئے فی زمانہ اشد ضروری ہیں۔

ہر ذی ہوش مسلمان آج بڑی ندامت کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کی سب سے بڑی وجہ اسلام کو پس پشت ڈال کر بے راہ روی اور بیدینی کی وہ عالمگیر روش ہے جو آج بھی مسلمانوں کی عادتِ ثانیہ کا حکم رکھتی ہے اور کون نہیں جانتا کہ مسلمان نے جب قرآنی احکام کی تعمیل چھوڑ دی۔ آستانۂ الوہیت سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔ ظاہری ترقی اور

دنیاوی جاہ و جلال نے بھی اس سے کنارہ کر لیا۔ جس مسلمان نے تقویٰ اور پاکیزگی اختیار کی، وہ کامیاب و کامران ہوا۔ مگر جس نے بے دینی اور حق فراموشی کو اپنا شعار بنایا وہ ذلیل و خوار ہوا۔ جس نے اپنے خالق کے لئے سب کچھ کھویا، اُسے گوہرِ مقصود ہاتھ آیا۔ جس نے اپنے مالکِ حقیقی کے نام کی احیاء کے لئے نقدِ جاں حاضر کر دی اُسے حیاتِ دوام نصیب ہوئی۔ مگر جسے جان و مال عزیز ہوئے، اُسے بھوک اور موت نے آن دبوچا۔ جسے خدا عزیز ہوا، اُسے حکومت و دبدبہ نصیب ہوا۔ مگر جسے حکومت اور دقار کی چاہت بڑھی، ذلّت و محکومی اُسے حصّہ میں ملی ——— الغرض بے دینی مسلمانوں میں تنظیم و اتحاد کے علاوہ اعلیٰ کردار اور بلند اخلاق کے فقدان کا باعث بنی، اور آہستہ آہستہ ان تمام خصوصیات سے مسلمان ہاتھ دھو بیٹھے جو مقربانِ بارگاہِ الٰہی کے اندر پائی جاتی ہیں۔

المختصر یہ کہ مسلمان حقیقی مسلمان بن کر تمام دُنیا کا حاکم بنا۔ جب مسلمان، مسلمان نہ رہا تو ذلیل و مقہور ہو کر رہ گیا۔ جو واضح طور پہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب تک مسلمان دوبارہ حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں بن جاتا، اُس وقت تک اس کیلئے عروج و ترقی کے تمام دروازے بند رہیں گے۔ بظاہر یہ امر بہت سیدھا سادہ اور آسان دکھائی دیتا ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ یوں تو شاید سب ہی اسلام پر عمل پیرا ہونے کی خواہش رکھتے ہوں۔ مگر سوال مسلمان کی صرف خواہش کا نہیں بلکہ اُسے عملی جامہ پہنانے کا ہے۔ آخر سچا مسلمان بننے کی حقیقی خواہش اگر تمام مسلمانوں کے دِلوں میں موجود ہے۔ تو وہ کونسا امر ہے جو آج اس خواہش کی تکمیل کے رستہ میں روک کا موجب بن رہا ہے؟ یہی وہ سوال ہے جسے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہمارے مذہبی راہنماؤں نے ٹھوکر کھائی۔ اور یہی وہ سوال ہے جس پہ آج بھی صحیح معنوں میں تدبر مسلمانوں کے لئے بہت اہم ہے۔ دراصل ہمارے علماؤں اور راہنماؤں نے یہ خیال کر لیا کہ ہمارے پاس ہدایت موجود ہے۔ یعنی قرآن مجید کی تعلیم مکمل اور مفصل رنگ میں موجود ہے۔ نیز یہ کہ مسلمان جب بھی چاہے اس نسخہ کو استعمال کر کے شفا حاصل کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہی وہ سب سے بڑی غلط فہمی ہے جس نے گذشتہ کئی سالوں سے مسلمانوں کو ایک ایسے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے کہ اصلاحِ مرض کے لئے نسخہ کا استعمال تو درکنار اس نسخہ کو سمجھنا بھی اُن کیلئے محال ہو رہا ہے۔ یہ وہ غلط فہمی ہے جس کا صرف عوام ہی شکار نہیں ہیں بلکہ بڑے بڑے سمجھ دار اور تعلیم یافتہ مسلمان بھی اس فریب میں ایک عرصہ سے مبتلا چلے آتے ہیں۔ چنانچہ اس برِّعظیم کی تقسیم سے پہلے جب اصلاح قوم کی غرض سے کی گئی علماء کی اِکّا دُکّا کوششوں سے عوام مایوس ہو گئے۔ تو انہوں نے مسلمان کے مسلمان ہو جانے کی امیدوں کو قیامِ پاکستان کے ساتھ وابستہ کر لیا۔ چنانچہ تقسیم سے پہلے مسلمانوں کے عوام و خواص کو یہی کہتے سُنا گیا کہ "پاکستان بنے گا تو اسلام کی حکومت قائم ہوگی"۔ اور آج پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان کے گوشے گوشے سے یہی صدا بلند ہو رہی ہے کہ "اب پاکستان بن گیا ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ اسلام کا نفاذ کرے"۔ یا یہ کہ "پاکستان میں شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ ہونا چاہیئے"۔ وغیرہ۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ یعنی کیا سیاسی غلبہ اور اسلام کا غلبہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ یا کیا حکومت عوام میں تقویٰ اور روحانیت پیدا کر سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔ کیونکہ اگر سیاسی غلبہ کے نتیجہ میں اصلاحِ عوام، اور اس سے بھی بڑھ کر روحانیت کا قیام ممکن ہوتا تو اللہ تعالیٰ انبیاء کو پہلے ہی دن بادشاہت کیوں عطا نہ کر دیتا؟ ایسا خیال کرنا دراصل تاریخِ مذہب سے ناواقفیت کی بناء پر ہے۔ کیونکہ مختلف مذاہب کی تاریخ میں ہمیں ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ جب اللہ تعالےٰ کے نام کو بلند کرنے، دِلوں میں تقویٰ اور پاکیزگی پیدا کرنے کے لئے کوئی کانفرنس ہوئی ہو۔ یا کچھ لوگ مل بیٹھے ہوں اور انہوں نے کوئی مجلس اس غرض کے لئے بنائی ہو کہ کوشش کر کے لوگوں کے لئے روحانیت کو قائم کیا جائے۔ ایسا نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ اِسی طرح انبیاء نے کبھی بھی جبر کے ذریعہ اصلاحِ عوام کا کام نہیں کیا۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی اپنی قوم کی اصلاح سیاسی اقتدار سے نہیں کی

کیونکہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ پھر معلوم نہیں ہمارے مسلمان بھائیوں نے کس طرح یہ یقین کر لیا کہ پاکستان کے قیام کے بعد قانون کے استعمال اور حکومتی رعب کے بل بوتے پر مسلمان کا دل خدا کی طرف مائل ہو جائے گا! اور خود بخود مومنانہ شان اس کے اندر پیدا ہو جائیگی۔ کیونکہ جہاں تک تو حقوق اللہ کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ قانون اس معاملے میں بالکل بے بس اور عاجز ہے۔ محبتِ الٰہی قانون سے پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ پس اسلامی نظام جس کی بنیاد ہی محبتِ الٰہی پر ہے، اس کا حکومت کی کوششوں سے قائم ہو جانا اسی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ لیکن لمحہ بھر کے لئے اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ حقوق اللہ کی ادائیگی حقوق العباد پر اثر انداز نہیں ہوتی تو بھی مندرجہ ذیل امور اسلامی نظام کو حکومتی اقتدار سے عملی جامہ پہنانے کے رستہ میں روک نظر آتے ہیں۔

اوّل یہ کہ اسلام ایک اختیاری مذہب ہے۔ جیسا کہ ہر مذہب کے لئے اختیاری ہونا ازبس لازمی ہے۔ ورنہ سزا اور جزا کا تصوّر بالکل لغو اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کسی ملک کے افراد کا اسلام کے کسی بھی اصول پر عمل خود اختیاری ہونا چاہیئے تا اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں کے لئے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہو سکیں۔ اس لحاظ سے بھی قانون کے ساتھ افراد کو اسلام کی تعلیم پر عمل کرنے پر مجبور کرنا خود اسلام کی تعلیم کے منافی ہوگا۔

دُوسرے ایک ملک میں بسنے والے افراد گو پیدائشی مسلمان ہی ہوں ضروری نہیں کہ وہ اسلام کو ہی اپنی اُخروی نجات اور دُنیوی ترقی کا ذریعہ خیال کریں۔ اور ایسی مثالیں ایک نہیں بے شمار دیکھنے میں آئی ہیں کہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونیوالے (اب بھی جبکہ حکومت نے قانونِ اسلامی کو رائج نہیں کیا) برسرِ عام منبر پر کھڑے ہو کر پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اسلام ([illegible]) ناقابلِ عمل اور مُردہ طاقت (نعوذ باللہ) ہے۔ کیا ایسے لوگوں کو بھی اسلامی قانون پر عمل کرنے کیلئے مجبور کیا جائیگا۔ یا مرتد یا غیر مسلم قرار دے کر الگ کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسے تمام لوگ جو پاکستانی ہیں خواہ وہ کسی بھی نقطۂ خیال سے تعلق رکھتے ہوں۔ سیاسی حقوق کے لحاظ سے مساویانہ سلوک کے مستحق ہونے چاہئیں۔ پس اس لحاظ سے بھی مسلمانوں کا ایک معتد بہ حصہ شرعی قانون کی گرفت سے آزاد ہو جائیگا۔ اور عملاً اگر ایسے افراد اکثریت میں آجائیں۔ تو پھر حکومت اسلامی کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

تیسرے اگر ملک کی اکثریت زبان سے شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ پر اظہار رضامندی بھی کر دے تو بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا محض زبانی رضامندی ہی عمل صحیحہ کے لئے کافی ہے؟ تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ وہی لوگ جو عملی مظاہرے کے وقت زبان سے اسلام کا دم بھرتے تھے، بودے ثابت ہوئے۔ کیونکہ قانون محدودے چند آدمیوں کے دلوں میں قوت اور ڈر پیدا کر کے ان سے اپنی بات تو منوا سکتا ہے۔ ملک کے ملک کی نہیں۔ مثلاً حال ہی میں حکومت پنجاب نے شراب کی مخالفت کا آرڈیننس پاس کیا تھا۔ مگر اس کے خلاف وہ طوفانِ بدتمیزی بپا ہوا کہ توبہ۔ اور اب اس آرڈیننس کی موجودگی میں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ پنجاب میں شراب کا استعمال ختم ہو گیا ہے۔

امریکہ میں جب شراب کے خلاف قانون نافذ ہوا تو عملاً شراب کے استعمال میں زیادتی ہو گئی۔ اور وہ قانون حکومت کو واپس لینا پڑا۔ یہ مثالیں اس امر کو بخوبی واضح کر دیتی ہیں کہ کسی ایسے قانون کو نافذ کرنا جو عوام کی صرف زبانی حمایت لئے ہوئے ہو۔ عملاً دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔

اس ضمن میں چوتھا قابلِ غور امر یہ ہے کہ قرآن عربی زبان میں ہے۔ جو ہمارے ملک میں بہت کم بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ اسلام کے حقیقی نفاذ کے لئے ضروری ہے کہ عوام قرآن شریف کے معانی و مطالب کو سمجھیں۔

اور اُن پر عمل پیرا ہونے کی سعی کریں۔ اس روک کو دُور کرنا گو ناممکن نہیں تاہم اس کے لئے جو کوشش درکار ہے۔ اس کی طرف بھی کوئی توجہ نظر نہیں آتی۔

پانچویں روک ملک میں مختلف فرقوں کی موجودگی ہے۔ اسلام کی تشریح اور قرآن کریم کی تفسیر کے متعلق آج کے علماء میں ہی نہیں بلکہ شروع سے ہی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کے عملی نفاذ کیلئے ان اختلافات کی موجودگی میں کس کے نقطۂ خیال کو ترجیح دی جائے؟ ظاہر ہے کہ ان اختلافات کے تصفیہ کے لئے ہمیں کسی حَکَم اور عَدَل کا وجود تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ جس کے متعلق شاید ہمارے عوام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کی اسلام میں گنجائش نہیں اور یا شاید وہ اس کی ضرورت ہی سرے سے تسلیم نہیں کرتے۔ بہرحال اگر اس کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ان اختلافات کو دُور کرنے اور اسلام کے دوبارہ احیاء کیلئے آج اس زمانے میں کس کو حکم اور عدل بنا کر بھیجا ہے؟

یہ وہ چند دقتیں ہیں جن کی طرف ہمارے عوام و خواص ابھی تک متوجہ نہیں ہوئے۔ اور جن کی طرف سے عدم توجہی بڑے خطرناک نتائج کا باعث بن سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی، اُن کے راہنما اور علماء اپنے اختلافات کو بھلا کر اور دیگر تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھکر ان ضروری امور کی طرف توجہ کریں۔ کیونکہ اگر ان کا مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کا دعویٰ سچا ہے۔ تو مندرجہ بالا مشکلات کی موجودگی میں انہیں فی زمانہ اسلام کے عروج کے لئے اپنے نقطۂ نظر کو اس رنگ میں تبدیل کرنا ہوگا کہ مذہبی انقلاب کے لئے جس طرزِ عمل کی ضرورت ہے وہ اختیار کیا جاسکے۔ ورنہ اسلام کے احیاء کی تمام امیدیں اور کوششیں بے کار ہو جائیں گی۔

اشتراکیت کیا ہے؟

"کیا وہ خواب جو مارکس نے دیکھا، یا اس کی وہ تعبیر جو لینن نے کی اور لینن ازم کے نام سے یاد کی گئی، یا وہ تفسیر جسے سٹالن نے اپنے عہد میں رائج کیا، یا وہ مفہوم جو ہر اشتراکی کے دماغ میں موجود ہے؟

اشتراکیت ایک ایسا وہم ہے جو فلسفی کے دماغ سے نکل کر ایک ایسا عارضہ بن جاتا ہے کہ انسان کے خون میں نہا کر بھی اس کی بہیمانہ فطرت تسکین نہیں پاتی یا انگریزی کے ایک شاعر کے الفاظ میں کہ :-

"کمیونسٹ کون ہے؟ وہ جو غیر مساوی دولت کی تقسیم کا ایسے رنگ میں خواہشمند ہے کہ خواہ وہ نکما ہو، اور خواہ حریص دولتمند، اپنی جیب سے پائی دے کر آپکا روپیہ ہڑپ کر لینے میں کمال رکھتا ہو؛ یعنی دوسرے کے مال و دولت کو چھیننے کے خود غرضانہ مگر منظم پروگرام کا دوسرا نام اشتراکیت ہے۔"

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!

حسام الدین ظفر

آپ سے ملیئے!

"باتھ" لینے جارہا ہوں۔ تم "ویٹ" کرو "ڈریس چینج" کرکے "واک" کو چلیں گے۔ یہ ہے وہ انگریزی اُردو کی معجون مرکب جو میرے عزیز دوست سعید کے روزمرہ میں دخل پاچکی ہے۔ مَیں نے لاکھ بار سمجھایا۔ کہ بندۂ خدا! یا تو تمام گفتگو انگریزی میں کرلیا کرو۔ یا پھر صرف اُردو پر اکتفا کرو۔ اِن دونوں زبانوں کا بیڑا غرق کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر سعید ہنس کر خاموش ہوجاتا ہے۔ آج مَیں نے سعید کو پھر سمجھایا۔ اور کافی دیر تک سر کھپانے کے بعد وہ بُت رام ہوا کہ اب صرف اُردو میں ہی گفتگو کرونگا۔ مگر دو منٹ بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ اشرف سے کہنے لگا۔ "ڈیئر! چلو "شاپنگ" کرنے چلیں۔ اور "باربر" سے "ہیئر" بھی "کٹ" کرالتے ہیں جب مَیں نے سعید کو آواز دی۔ تو اُس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے کھسیانی بلی کھمبا نوچے

سعید کی ہر ادا مغربی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ . . . صاحب سویرے نو بجے اُٹھتے ہیں۔ اور "گرم پانی لاؤ" کا حکم دیکر پھر دراز ہوجاتے ہیں۔ یہ پانی وضو کرنے کے لئے نہیں۔ صرف "شیو" کے لئے منگایا جاتا ہے۔ پھر "باتھ" سے فارغ ہوکر "بریک فاسٹ" اور "ڈریس چینج" ہوگا۔ "ڈریس" پر کافی سے زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ مجھے زور سے آواز دیکر پوچھتا ہے۔ "ظفر! کونسا سُوٹ پہنوں آج؟ میرے خیال میں "گیبرڈین"۔ بہتر رہے گا۔" "وہاٹ ڈو یو تھنک؟"

سُوٹ زیب تن کرنے سے پہلے شغلِ شانہ ہوتا ہے۔ پہلے تمام زلفیں رُوئے منوّر کا نقاب بن جاتی ہیں۔ آئینے کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اہلِ نظارہ کی دُعائیں یُوں قبول ہوتی ہیں کہ ناک کی سید ھ سے آدھے بال ایک طرف اور آدھے بائیں جانب پلٹ پڑتے ہیں۔ پھر ایک ہاتھ سے کنگھا پکڑ کر اور دوسرے ہاتھ سے ایک ایک بال سنبھال کر کبھی آگے کبھی پیچھے کبھی دائیں۔ کبھی بائیں۔ غرض کہ مکمل اطمینان کرلینے کے بعد کہ کوئی بال مانگ کی "روش" سے اِدھر اُدھر تو نہیں ہے۔ تا آنکہ یہ شغل گُدّی پر دونوں جانب ایک ایک کلپ لگالینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔

بالوں سے پہلے "میک اَپ" پر بھی کافی وقت لگتا ہے۔ "پاؤڈر کریم" کی شیشی اُٹھاکر اُنگلی پر تھوڑی سی کریم لگاتے ہیں۔ دونوں ہتھیلیوں میں مسلتے ہیں اور پھر عارضِ گندم گوں پر۔ پھر اُسے میدہ شہاب بنانے کے لئے "ٹووِش" ——— ؟

اِس طنازی کے بعد سُوٹ پر بُرش پھرتا ہُوا نظر آتا ہے۔ پھر بُوٹ صاف کرکے ٹائی کی "ناٹ" درست ہوتی ہے خیر اس کی تفصیل کو چھوڑ دیجئے۔ اس تیاری کے مکمل ہو چکنے کے بعد اگر کبھی اُن سے پُوچھ بیٹھیں کہ :-

سعید صاحب آج کہاں کی تیاری ہے؟

یار تمہیں ہمارا "پروگرام" تو معلوم ہی ہوتا ہے۔

پھر بھی بتاؤ تو سہی!

اُو فُول! تم کو نہیں معلوم۔ آج ہم کو "ٹائم" دیا گیا ہے۔ جوزف کے گھر جانا ہے۔ (یوسف، سعید کے ایک دوست کا نام ہے۔ جس کو وہ انگریزی میں جوزف کہتے ہیں۔) وہ تمام لوگ "ویٹ" کر رہے ہوں گے۔

سارا دن کہیں نہ کہیں گزارنے کے بعد شام کو "سٹینڈرڈ" یا "میٹرو" میں "ڈنر" لیتا نظر آئے گا میرا یار۔ رات کے دس بجے واپس آکر سوٹ اُتارنا شروع ہوتا ہے۔ اور "سلیپنگ سوٹ" پہنا۔ قصہ کوتاہ سگریٹ کے دو تین کش لگا کر بستر پر دراز ہو جاتا ہے۔

ایک روز میں نے کہا۔ بھئی سعید! کبھی تو خوفِ خدا بھی چاہیئے۔ کبھی نماز . . . . .

سعید بولا:۔ او یُو! ہر وقت نصیحت نہ کیا کر ظفر!۔ خبر ہے میری پتلون کی "کریز" خراب ہو جاتی ہے۔ اچھا ظفر! بائی بائی۔

میں منہ دیکھتا رہ جاتا ہوں اکثر۔ مگر سعید وہیں کا وہیں ہے۔

مجیب الرحمٰن صادق

غزل

ارمان و آرزو کو مٹا کر چلے گئے
دُنیائے دِل میں حشر اٹھا کر چلے گئے

کلیوں کو مست اپنے تبسّم سے کر دیا
پھولوں کو بیقرار بنا کر چلے گئے

بیخود بنا دیا تھا تو ہٹتے نہ پاس سے
یہ کیا کیا کہ ہوش میں لا کر چلے گئے

پروانہ وار میں کبھی آیا جو بزم میں
محفل کے سب چراغ بجھا کر چلے گئے

اچٹی ہوئی نظر سے اُدھر دیکھتے رہے
ہلکا سا ایک جام پلا کر چلے گئے

صادق انہیں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں آجکل
جو ہم سے خود ہمی کو چُرا کر چلے گئے

مُصلِحُ الدّین بنگالی

ایک رات

سُورج کی کرنیں تاریکی کی آغوش میں چھپ چکی تھیں۔ رات کا وقت تھا۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک، اور موسلادھار بارش کے شور سے طرح طرح کی مہیب آوازیں بھی پیدا ہو رہی تھیں۔ میرے خیالات کے محل مسمار ہو رہے تھے۔ مَیں مایوسی کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ . . . . . بکوئی بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ میرے تمام ساتھی بستر پر دراز مزے کی نیند سو رہے تھے۔ نیم بیداری کی حالت میں انہیں میری بابت بھی یہی گمان ہوگا کہ مدت ہوئی سو چکا ہوں۔ . . . لیکن انہیں کیا معلوم کہ مَیں اس وقت کس دنیا میں پھر رہا تھا اور کونسا امر میری نیند میں روک بن رہا تھا؟ میری آنکھیں جب بھی بستر کی طرف اُٹھتیں۔ بچھونا کاٹ کھانے کو پڑتا۔ . . . اسوقت میں معمول سے زیادہ تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ یہ تنہائی طبعیٔ دنیا سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ محض دل و دماغ سے واسطہ رکھتی ہے۔ میرے دل میں بعض امیدیں اور خواہشات تھیں جنہوں نے ابھی تک کوئی شکل اختیار نہ کی تھی۔ سب سے بڑھ کر اسوقت میرے سامنے وہ شاندار منزلِ مقصود تھا جس تک پہنچنے کیلئے مَیں تخیلات کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ . . . . میرا ذہن پریشان خیالی کی آماجگاہ بن گیا تھا اور یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی دُکھوں کے بھنور میں پھنس گئی ہو یا جس طرح کشتی طوفان میں۔ . . . . بارش ختم ہو چکی تھی۔ آندھی بھی تھم چکی تھی مگر ابھی بادل سروں پر منڈلا رہے تھے۔ . . . مَیں کتابِ فطرت کا مطالعہ کرنے کیلئے اپنے کمرہ سے باہر نکلا۔ اور ایک جانب چلنے لگا۔ . . . نامعلوم کس سمت . . . مَیں خراماں خراماں چلے جا رہا تھا۔ . . . . اپنے خیالات میں مگن فطرت کا مطالعہ کرتے ہوئے۔ . . . اتنے میں دریائے راوی کے کنارے جا نکلا جو کسی موہوم منزل کی طرف مستانہ وار بڑھ رہا تھا۔ کنارے پر ٹہلنے لگا۔ اور کتابِ فطرت کی ورق گردانی میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ . . . .

بادلوں کے چند ٹکڑے اِس نیلگوں آسمان پر ستاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ . . . یہ نظارہ دیکھ کر بچپن کی بعض یادیں میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگیں۔ . . . مگر اسوقت میری کیفیت کچھ اور تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری زندگی پر بھی اسی طرح رنج و غم کے بادل محیط ہیں جس طرح آسمان پر۔ اور میرے دِل میں بھی اسی طرح شور و ہنگامہ برپا ہے جس طرح آسمان میں بادلوں کی گرج اور کڑک سے۔ لیکن آہ! اِن کالے کالے بادلوں میں چمکنے والے تاروں کی طرح اُمید کی کوئی جھلک مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ جگمگاتے ہُوئے تارے میری اس حالت زار پر نگاہِ حسرت و افسوس کے ساتھ میری جانب دیکھ رہے تھے۔ دوسری طرف دریا کی روانی کو دیکھ کر ——— میرے دل سے یہ صدا اُٹھی ——" اے دریا کی مچلتی ہُوئی لہرو! میری زندگی بھی تمہاری مانند ہے۔ مَیں بھی تمہاری مانند دشوار گذار منازل طے کر رہا ہوں۔ میری زندگی میں تم سے زیادہ تلاطم خیزیاں موجود ہیں۔ تم سر پھوڑ، سینہ توڑ چٹانوں سے ٹکرا کر ساحل تک تو پہنچ جاتی ہو مگر میرا بحرِ تمنا بے ساحل ہے۔ . . . ." اِتنے میں ایک دِلکش اور دِلفریب نظارہ نمودار ہوا۔ . . . مایوسی کی تاریکی میں ایک ہلکی سی کرن نظر آنے لگی۔ میری خیالی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی سرزمین پھرنے لگی جو میری اُلفتوں کا مرکز اور خوشیوں کا منبع تھی۔ مَیں اُس تک پہنچنا چاہتا تھا میری بے قرار رُوح اس منزل تک پرواز کرنا چاہتی تھی۔ مگر ایک دریا میرے سامنے حائل تھا۔ مَیں چاہتا تھا کہ خود کو اِسی وقت ہی دریا میں ڈال دوں اور تیر کر وہاں جا پہنچوں کہ اتنے میں

(باقی ص ۳۵ پر)

بشیر احمد رفیق

اُردو شاعری پر ایک نظر

جذبات کو ایسے رنگ میں بیان کرنے کا نام شاعری ہے کہ پڑھنے یا سُننے والے پر وہی اثرات مُرتّب ہو جائیں جو شاعر پر چھا گئے تھے۔ یا جس اثر سے ہمیں وہ متأثر کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً حسن و عشق۔ حزن و انبساط۔ غم و رنج۔ عفو و غضب۔ یا قدرتی مناظر دیکھ کر بہار اور خزاں۔ گرمی اور سردی۔ دشت و دریا کی فضاء پر ایسے پیرائے میں کھینچنا کہ پڑھنے یا سُننے والے کی آنکھوں کے سامنے وہی مناظر گھومنے لگیں۔ اِس منظر کشی کو شاعری کہتے ہیں۔

مولانا شبلی اپنی کتاب "شعر العجم" حصّہ چہارم کے صفحہ ۸۹ پر لکھتے ہیں کہ :-

"شاعری صرف محسوسات کی تصویر نہیں کھینچتی۔ بلکہ جذبات اور احساسات کو بھی پیش نظر کر دیتی ہے۔ اکثر ہم خود اپنے نازک اور پوشیدہ جذبات اور احساسات سے واقف نہیں ہوتے۔ یا ہوتے ہیں تو صرف ایک دُھندلا دُھندلا سا نقش نظر آتا ہے۔ شاعری پس پردہ چیزوں کو پیش نظر کر دیتی ہے۔ دُھندلی چیزیں چمک اٹھتی ہیں۔ مٹا ہوا نقش اُبھر آتا ہے۔ کھوئی ہوئی چیز ہاتھ آجاتی ہے۔ خود ہماری رُوحانی تصویر جو کسی آئینہ کے ذریعے ہم نہیں دیکھ سکتے۔ شعر ہم کو دکھا دیتا ہے"

غرض شاعری جذبات کے بیان کرنے کا دُوسرا نام ہے۔ شاعری کے متعلق بہت سے لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ یہ تضیع اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اُن کے نزدیک شاعر قوم کا ایک ناکارہ وجود ہے۔ اور بجائے قوم کو فائدہ پہنچانے کے نقصان پہنچاتا ہے۔

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ شعر گوئی اکتسابی علم نہیں ہے۔ بلکہ یہ جوہر قدرت جسے ودیعت فرمائے وہی شاعر بنتا ہے۔ اگر جبلّی موزونیٔ طبع نہ ہو تو بہ ہزار تبحّر علمی کوئی شخص شاعر نہیں بن سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ شاعری قدرت کا عطا کردہ ایک جوہر ہے۔ اور قدرت کی عطا بیکار نہیں ہوتی۔

البتہ اس سعادت کا ناجائز مصرف بسا اوقات ادبار کا باعث ہو جاتا ہے۔ اور بیان کی مبالغہ آرائی سے قوموں کے اذہان میں انحطاط پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

لیکن اسی شاعری کا دوسرا اور درخشندہ پہلو بھی آپ کے سامنے ہے۔ جبکہ صرف شاعر کا کلام قوموں کو بیدار کر دیتا ہے۔ مثلاً ایڈورڈ بادشاہِ انگلستان نے جب ویلز پر چڑھائی کی تو ویلز کے لوگ سخت گھبرا گئے۔ وہ ہمّت ہار بیٹھے۔ لیکن اُن کے شعراء نے اہلِ ویلز کی غیرت کو اُبھارنے کے لئے ایسے ایسے ولولہ انگیز اشعار کہے کہ وہ مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ اور انتہائی اضطراب اور سراسیمگی کی حالت میں بھی اطاعت قبول کرنے کے لئے تیار

نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایڈورڈ کی فوج کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا۔ گو بعد میں ویلز کی فتح کے بعد ایڈورڈ نے اُن تمام شعراء کو قتل کروا دیا۔

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ شاعری قوم کے لئے اکثر زحمت ثابت ہوئی ہے۔ اس نے خوابیدہ قوم کو بیدار کیا ہے۔ القصّہ یہ کہنا کہ شاعری ہماری سوسائٹی کے لئے مفید نہیں، سراسر زیادتی ہے۔

اِس تمہید کے بعد میں اصل مضمون کی جانب رجوع کرتا ہوں۔ تاکہ شاعری کی مختلف اقسام پر روشنی پڑ سکے۔

اُردو شاعری کے لئے ردیف و قافیہ کا استعمال ضروری قرار دیا گیا ہے۔ (اگرچہ آجکل چند جدّت پسند اِس خیال کو تسلیم نہیں کرتے)۔

غزل:۔ غزل میں عام طور پر حسن و عشق کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ غزل کے لفظی معنی ہیں "عورتوں سے خطاب"۔ اس کی ابتداء ایران سے ہوتی ہے۔ اس کا ہر شعر الگ خیال کا حامل ہوتا ہے۔ غزل کے اشعار عام طور پر پانچ سے گیارہ تک ہوتے ہیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ غزل میں عام طور پر حسن و عشق کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مگر بعد میں کئی شعراء نے غزل کو تصوّف میں رنگ دیا۔

غزل اُردو شاعری کی جان ہے۔ اُردو جاننے والا بوڑھا، بچّہ، عورت، مرد سبھی غزل کے مدّاح ہیں۔ ہر موقعہ پر غزل پڑھی اور سُنی جاتی ہے۔

قصیدہ:۔ وہ نظم جو کسی کی مدح یا ہجو میں ہو۔ قصیدہ کہلاتی ہے۔ اس کی تعداد اشعار عموماً پچیس ۲۵ اور زیادہ سے زیادہ ایک سو ستّر ۱۷۰ تک ہوتی ہے۔

قطعہ:۔ قطعہ جس کے معنے ٹکڑے کے ہیں۔ اس کی تعداد کم از کم دو ۲ شعر اور زیادہ سے زیادہ جتنے بھی ہوں۔ قافیہ کی پابندی لازمی نہیں۔

رباعی:۔ رباعی میں عام طور پر دو ۲ شعر ہوتے ہیں۔ پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ رباعی میں آپ ہر قسم کا مضمون بیان کر سکتے ہیں۔

مثنوی:۔ جذبات انسانی، مناظرِ قدرت، واقعہ نگاری، تخیّل۔ اِن تمام قسم کے خیالات کو بیان کرنے کے لئے مثنوی ہے۔ مثنوی اُردو نظم کی سب سے اچھی صورت ہے کیونکہ اس میں آپ ہر خیال کو بیان کر سکتے ہیں۔ عام طور پر مثنوی میں کوئی تاریخی واقعہ یا قصّہ بیان کیا جاتا ہے۔ اور اس میں ردیف کی کوئی قید نہیں ہوتی۔

واسوخت:۔ جس میں عاشق اپنے معشوق کی بے وفائی کا تذکرہ کرتا ہے۔

تاریخ:۔ جس میں شاعر کسی واقعہ کی تاریخ حروف ابجد کے لحاظ سے نکالتا ہے

مرثیہ:۔ کسی مرے ہوئے شخص کے اوصاف بیان کرنے کا نام "مرثیہ" ہے۔ مرثیہ میں نہ صرف مُردہ لوگوں کی توصیف کی جاتی ہے بلکہ صبح و شام کا سماں، جنگ کی گرمی، مُردوں کی آہ و بُکا کا بھی صحیح نقشہ کھینچا

جاتا ہے۔ مرثیہ کی ابتداء عرب سے ہوئی ہے۔ عرب شعراء نہایت مؤثر انداز میں مراثی لکھا کرتے تھے۔ اُردو شاعری میں مرثیہ نہایت قدیم صنف ہے۔ مولانا شبلی کے نزدیک مرثیہ کی ابتداء سودا و میر سے پہلے ہو چکی تھی۔ مرثیے پہلے سوز و گداز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے۔ لیکن آجکل تحت اللفظ کا بھی رواج ہو چکا ہے۔

اُردو مرثیہ کو کمال تک پہنچانے والے شعراء یہ ہیں :-

میر ضمیر۔ میر انیس۔ میرزا دبیر۔ میر ضاحک۔ وغیرہ۔

علاوہ ازیں دیگر اقسام و اصناف سخن پہ بخوف طوالت سر دست روشنی نہیں ڈالی جاتی۔

شاعری کی اس مختصر تعریف کے بعد میں یہ بیان کروں گا کہ اُردو شاعری کی ابتداء کہاں سے ہوئی۔ چونکہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اُردو شاعری کی ابتداء ہی "زبان اردو" کی ابتداء ہے۔ اس لئے میں مختصر طور پر اُردو زبان کی ابتداء کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔

"اردو" ترکی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی لشکر گاہ کے ہیں۔ عہد مغلیہ کے درباری مؤرخین نے بھی "اردو" کو "لشکر گاہ" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

چنگیز خان کی اولاد کے حکمران جب کسی ملک پر چڑھائی کرتے تھے۔ تو ہمیشہ زریں خیموں میں رہتے تھے اس لئے ان کی لشکر گاہوں کو "اُردوئے معلّیٰ" کہتے تھے۔ اور وہ بادشاہ "خوانین اُردوئے معلّیٰ" کے نام سے مشہور ہوئے۔

زبان اُردو کو "ریختہ" بھی کہتے تھے۔ جس کے معنے ہیں گری پڑی چیز۔ مگر فارسی میں "ریختہ" اس کلام کو کہتے ہیں۔ جو دو چار زبانوں کے اختلاط سے بنی ہو۔ اور چونکہ اُردو بھی مخلوط زبان ہے۔ اس لئے یہ زبان کچھ عرصہ "ریختہ" بھی کہلائی۔

بقول سید شمس اللہ اردو زبان کا منبع "برج بھاشا" ہے۔ برج بھاشا آریوں کی قدیم زبان ہے۔ یہ زبان چونکہ برج (بہار) میں بولی جاتی تھی۔ اس لئے اس کا نام برج بھاشا پڑ گیا۔

نصیر حسین خیال بھی اس خیال کے حامی ہیں کہ "اردو" کا منبع بھاشا ہے۔ وہ اپنی کتاب "داستانِ اُردو" کے صفحہ ۳۰ پر لکھتے ہیں :-

"ہماری بھاشا کی یہی وہ تدریجی ترقی و وسعت تھی۔ جس نے پردیسیوں کو بھی یہ چاکر اپنا کرلیا۔ اور ان کی رلی تکلف زبانوں سے آخر ایک نیا خطاب "اُردو" پاکر اسے تسلیم کرلیا۔"

اُردو کی ابتداء کے متعلق مؤرخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سر سید احمد خان رح کے خیال میں اُردو زبان کی ابتداء سنہ ھ میں ہوئی۔

میر امن دہلوی ۹۶۳ سنہ ھ بتاتے ہیں۔

مشہور مستشرق مسٹر بیمس بھی اس کی ابتداء سنہ ۹۶۳ بتاتا ہے۔

ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے بیان کے مطابق اُردو کی ابتداء ۱۷ سنہ ھ میں ہوئی۔

لیکن درحقیقت اس کی ابتداء چھٹی یا ساتویں صدی ہجری ہی میں ہوئی۔

حضرت امیر خسرو ؒ ۶۵۲ ھ میں پٹیالی ضلع اٹیہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے نظم و نثر میں نام پیدا کیا۔ انہی کو "طوطیٔ ہند" کا خطاب بھی ملا۔

آپ کی شاعری کو اُردو شاعری کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ آپ کی دو غزلیں جو بڑی مشکل سے تحقیق دستیاب ہوئی ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں :-

(۱)
خوار شدم زار شدم لُٹ گیا — در غمِ ہجر تو کمر ٹُوٹا ہے
یار نہیں دیکھتا ہے سُوئے من — بے گنہ ہم ساتھ عجب رُوٹھا ہے
رُوئے تو رونق شکن آفتاب — سرو بہ پیشِ قدِ تو بُوٹا ہے
گاہ زِ خسرو تو نہ گفتہ کہ بیٹھ — وہ چہ کند بھاگ مرا پھُوٹا ہے

(۲)
زرگر پسرے چو ماہ پارا — کچھ گھڑلے کچھ سنوار لے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکند — پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

اس سے اس امر کی کافی وضاحت ہو جاتی ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں اُردو زبان میں شاعری کی ابتداء حضرت امیر خسرو نے کی۔

امیر خسرو سے کر وَلی تک کا زمانہ (یعنی تین صدیاں) ایک طویل عرصہ تھا۔ لیکن اس عرصہ میں اُردو شاعری نے کوئی نمایاں ترقی نہ کی۔ البتہ اس زمانہ میں اُردو شاعری نے فارسی تراکیب۔ تلمیحات و تشبیہات و استعارات اور صنائع بدائع کو بے تکلفی سے اپنالیا۔

شاعری کے مختلف زمانوں کی تقسیم کے لحاظ سے ہم اس کو تین زمانوں یا دَوروں میں تقسیم کریں گے۔

(۱) دکنی دَور۔

(۲) اُردو شاعری دِلّی میں یعنی دُوسرا دَور۔

(۳) اُردو شاعری کا جدید رنگ یعنی تیسرا دَور۔

(۱) دکنی دَور:۔ شعرائے دکن کا تذکرہ کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ دکنی زبان کیا ہے؟

دکنی زبان ہندوستانی کی ایک شاخ ہے۔ اس زبان میں فارسی الفاظ بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اس زبان کی ابتداء مسلمان حکمرانوں سے ہوتی ہے۔ محمد تغلق کے تبدیلیٔ دار الخلافہ سے دِلّی کے ہزاروں باشندے دکن چلے آئے تھے۔ وہ اپنی زبان بھی ساتھ لیتے گئے۔ اب ان کی زبان اور قریبی دیگر زبانوں یعنی مرہٹی، تامل اور تلنگی کے اختلاط سے دکنی زبان کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

دکن میں علم و ادب کی ابتداء آٹھویں صدی ہجری سے ہوتی ہے۔ اس زمانے میں دکن میں کئی شعراء ہوئے جن کے حالاتِ زندگی آجکل دستیاب نہیں ہوتے۔ مثلاً غواصی - ابن نشاطی - ملا قطبی - نوری - طبعی - جنیدی - فائز - مرزا - وغیرہ - وغیرہ -

سلطان محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ لغایت ۱۰۲۰ھ) اب دکن کے ان شعراء کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے

دیوان موجود ہیں۔ اور جن کے حالات زندگی دستیاب ہو سکے ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلے سلطان محمد قلی قطب شاہ آتے ہیں۔ انہوں نے تمام اصناف سخن۔ مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعیات وغیرہ میں شعر کہے۔ قلی قطب شاہ پہلے شخص ہیں۔ جن کا کلام اُردو بصورت "دیوان قطب شاہ" موجود ہے۔

ان کے کلام میں ہندی کا بڑا اثر پایا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اور کئی شعراء اس زمانے میں ہوئے۔ مثلاً دولت۔ شاہ امین۔ عاجز۔ بحری۔ امین وغیرہ۔ اب ولی کا زمانہ آتا ہے۔

ولی (۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۳ء) امیر خسرو سے لے کر ولی تک کا زمانہ اُردو شاعری کا نہایت غیر معروف زمانہ ہے۔ اس عرصہ میں اُردو شاعری نے کوئی نمایاں ترقی نہ کی۔ ولی کو اس لحاظ سے اُردو شاعری کا آغاز تصور کرنا چاہیئے۔ ان کا نام شمس الدین اور تخلص ولی تھا۔

ولی ۱۶۶۸ء میں یعنی دسویں صدی ہجری میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ بیس برس تک وہیں تعلیم پائی۔ اس کے بعد احمد آباد چلے آئے۔ اور یہیں ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۳ء وفات پائی۔ انہوں نے شاعری کے ہر میدان۔ مثنوی۔ رباعی۔ غزل۔ قصیدہ وغیرہ میں طبع آزمائی کی۔

ولی کے بعد کئی شعراء ہیں۔ جو اس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً مہر۔ صابر۔ سراج۔ رضا۔ عرفی۔ عزلت۔ وغیرہ وغیرہ۔

ولی کے بعد دکن کا دور ختم ہوتا ہے۔ اور اُردو شاعری دِلّی کی جانب راجع ہوتی ہے۔

(۲) دِلّی کا دور :-

دہلی میں اُردو کی باقاعدہ ادبی حیثیت بارھویں صدی ہجری بتائی جاتی ہے۔ اگرچہ اس سے قبل بھی یہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

عالمگیر کے زمانہ میں اُردو شاعری نے صحیح معنوں میں یہاں جنم لیا۔ سب سے پہلے فارسی کے شعراء مرتضیٰ قلی خان فراق۔ میر شمس الدین فقیر۔ میرزا عبد القادر بیدل وغیرہ نے اس طرف توجہ کی۔ اور اُردو میں شعر کہنے شروع کئے۔ لیکن یہ اشعار بلند پایہ نہ ہوتے تھے۔ اور ان میں ابتذال اور سوقیانہ پن پایا جاتا تھا۔

اُردو شاعری جب دِلّی کے دور میں قدم رکھتی ہے۔ تو اس کے سرِ قافلہ میر تقی میر ہیں۔ ان کے عہد اور اس کے بعد کے زمانہ کے حالات کسی آئندہ فرصت میں پیش ہو سکیں گے۔

اسلم یاجوہ

زندگی

ایک مشہور فلاسفر "اڈلر" نے اپنی کتاب "آپ زندگی سے کیا مراد لیتے ہیں" میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ اس کی تمام بحث و تمحیص صرف اس محور کے گرد گھومتی ہے کہ زندگی ایک خاموش روشنی ہے جو ہمارے عام تعلقات کے لئے (خواہ وہ جسمانی ہوں یا مجلسی) مشعلِ راہ بن کر ان کو عورت کے نازک رشتہ سے منسلک کرتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں کارلائل نے اس مسئلہ کو چھوا تک نہیں۔ صرف ایک استفسار کے جواب میں جو زندگی کے بارے میں کیا گیا۔ اس نے کہا۔ "جو زندہ رہتے ہیں۔ ان سے پوچھو زندگی کیا ہے"۔ حقیقتاً کارلائل کی اس نیم خاموشی نے زندگی کے متعلق کافی کچھ کہا ہے۔ اس نے "زندہ رہنے" کا لفظ استعمال کر کے زندگی کی حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ کیا ہے۔ زندگی زندگی گزارنے کا نام نہیں بلکہ "زندہ رہنے" کا نام ہے۔ زندگی اس وقت تک زندگی ہے جبتک اس میں خون ہے، حرارت ہے اور جوش ہے۔

زندگی ہر اس انسان کا پیدائشی حق ہے جو زندگی گزارنا نہیں بلکہ زندہ رہنا چاہتا ہو۔ زندگی، ترقی کی شاہراہ میں رکنا یا ٹھہرنا نہیں جانتی۔ بلکہ بامِ اوج تک بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ زندگی اپنے حقوق اور خواہشات اپنے عمل سے منواتی ہے۔ وہ دنیا کی جذباتی رَو میں نہیں بہتی۔ زندگی قوت ارادی سے مزین ہوتی ہے۔ ہاتھ، دماغ اور دل اس کے سپاہی، سپہ سالار اور ناقابلِ تسخیر قلعے ہیں۔ زندگی اپنی گہرائیوں میں گم ہو جاتی ہے اور بلندیوں پر خدا سے جا ملتی ہے۔ اور انسان کو دولتِ اعتماد سے مالا مال کر دیتی ہے۔ ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

زندگی مشکلات سے ٹکرا کر اُبھرتی ہے۔ اور آرام سے زنگ آلود ہو جاتی ہے۔ زندگی سانس کو برقرار رکھنے کیلئے بہانے نہیں تراشا کرتی۔ بلکہ اپنے آپ کو ختم کر دیتی ہے۔ ع

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

زندگی کے رازوں کی تہ تک صرف وہی آدمی پہنچ سکتا ہے۔ جو خود زندہ ہو۔ اپنی زندگی کا حکمران ہو۔ اُس کی لُغت میں زندگی کے معنی ستار کی سُریلی آواز نہیں۔ بلکہ تلوار کی جھنکار ہے۔ ؎

زندگی کی کُل حقیقت کوہ کن کے دل سے پُوچھ!
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

زندگی خود عمل ہے۔ وجوہ و دلائل کی دال یہاں نہیں گل سکتی۔ ؎

بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق ❊ عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

خوب کہا ہے اقبال نے :- ع

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی

زندگی کا ایک سرا خدا تک پہنچتا ہے۔ اور لامتناہی ہے۔ اور دوسری طرف یہ کسی مدد کی محتاج نہیں۔ بلکہ متلاشی رہتی ہے کہ خدمت کا موقع ملے۔ زندگی اپنی فنا سے بے نیاز ہوتی ہے۔ قربانی پر اُسے فخر ہے۔ اور فی الحقیقت یہی اس کی شاندار کامیابی ہے۔ زندگی کا یہ نظریہ نہیں۔ ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اب سوال پیدا ہوتا ہے۔

۱- ہم ایسی زندگی کیسے حاصل کر سکتے ہیں ؟

۲- کیا ہم ایسی زندگی گزار سکتے ہیں ؟

دوسرے سوال کا جواب صرف یہ ہے کہ ہر شخص اپنے متعلق بہتر سمجھ سکتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور طور و طریق کا موازنہ مندرجہ بالا حقائق سے کر سکتا ہے۔ اگر کچھ کمی ہو تو سمجھ لے کہ زندہ نہیں بلکہ جی رہا ہے۔ اور اسے اپنے آپ کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

پہلے سوال کا جواب آپ کی اور راہنمائی کرے گا۔ آپ اپنی شخصیت کو ابھارنے کی کوشش کریں۔ شخصیت سے مراد آپ کے احساسات، قوّتِ ارادی اور علم سے ہے۔ یہ منتہائے نظر اپنے لائحہ عمل میں داخل کرتے ہوئے کہ ہم کو اپنے اندر اعتماد اور "بلند اخلاق" پیدا کرنے ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کو گرماتے چلے چلو۔ انہیں صلاحیتوں کی ترقی سے آپ زندہ رہ سکتے ہیں۔ وگرنہ زندگی گزارنے کے نقطۂ نظر سے آدمی اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔

احساسات کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ آپ میں قوّتِ عمل ہو۔ اور قوّتِ ارادی کے لئے بلند خیالی۔ اور خودی کے لئے نیک اور پاکیزہ عقائد۔ اور بڑے لوگوں کے احکامات کی بجاآوری۔ اور بلند اخلاقی کے لئے ضروری ہے کہ مناسب کام مناسب وقت میں مناسب طریقے سے سرانجام پائیں +

"ایک رات"

بقیہ صفحہ ۳۱

وہ سرزمین غائب ہوگئی۔ . . . اور اب میرے چاروں جانب تاریکی ہی تاریکی پھیل گئی۔ . . . اور میں . . . اس تاریکی میں ٹھوکریں کھاتا، راستہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ فریاد میرے لبوں تک آ آ کر رُک جاتی۔ . . . مگر آخر کار اس طوفان نے ایک دِلسوز پکار کی شکل اختیار کر لی۔ اور میں انتہائے یاس میں پکار پکار کر یہ کہہ رہا تھا۔ . . . .

" اے آسمانی فرشتو! میری دستگیری کرو۔ مجھے زندگی کے تاریک کنوئیں سے نکالو "

سیلانی کا سفرنامہ

آج پھرتے پھراتے نگار خانے پہنچے۔ کاٹھ کے اُلّو سُنے تو ہونگے آپ نے۔ لیکن دیکھے نہ ہونگے۔ اور اگر آپ بھی اُنہیں میں سے ایک نہیں ہیں تو سُنیئے اور شکر ادا کیجیئے کہ آپ کچھ پڑھ لکھ لئے ہیں، اور نہ کسی نہ کسی دقیانوسی شاعر کے برادر نسبتی کی اولاد سے آپکا سلسلۂ نسب ملا ہوا ہوتا اور آپ لازماً فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلات، نہ جانتے ہوئے بھی "کہت کبیر سُنو بھئی سادھو" ہوتے، یعنی" واہ واہ، سبحان اللہ، حضور نے قلم کی ٹانگ توڑ دی ہے۔ مہملیات کو نوازا ہے"۔ اور آپکو جب یہ داد نہیں، بیداد ملتی تو آپ ایک آنکھ چھوٹی اور دوسری بڑی کر کے بول پڑتے کہ صاحب! یہ سادہ سادہ لفظوں میں تُک بندی کر لی ہے۔ بھئی! ہم سے تو یہ سخت ترکیبیں نہیں آتیں۔ میاں کلام میں کچھ ندرت نہ ہوئی تو مزا آتا ہے نہ اُسکی مادہ۔

خیر، آمدم برسرِ مطلب، تو نگار خانے پہنچے۔ معلوم ہوا، ایک کالا دا غا جا رہا ہے۔ ہے ذرا آبنوسی مگر آواز میں کھرج ہے۔ سُنا ہے آپ پوتڑوں کے رئیس نہیں، شاعر ہیں۔ کہتے ہیں اُسکے داغے جانے پر عوام یادگاری دن منانے کی فکر میں ہیں کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔ کالا سمجھتا ہے کہ مچھلی پکڑنا، غوطہ خوری، کان کا میل صاف کرنا، تیل مالش کی آواز لگانی، کٹ پیس بیچنا، اور شاعری کرنا، سب ہموزن اور ہم طرح غزلیں اور رُباعیات ہیں۔ اُدھر آثارِ قدیمہ والے رسّی اور ڈنڈا لئے پھر رہے ہیں کہ کہیں مل جائے تو گھیر لائیں اور شاہی قلعہ میں رکھوا دیں۔ کیونکہ اگر شاعری کرتے کرتے یہ گنّے کا کھیت بونے لگا اور گڑ اور کھانڈ کی کھنڈسال کھول دی تو بلا وجہ مکھیاں بھنکنے لگیں گی، اور لُٹیا ڈوب جائیگی شعرا کی۔ نوح علیہ السلام کا زمانہ ہوتا تو انکی کشتی میں بچ نکلنے کی توقعات ہوسکتی تھیں مگر اب جبکہ کالے کافر کی آمد آمد کا عرصہ ہے، خدا ہی خیر کرے۔ کہیں اس دیہاتی کو یہ شہری نگل نہ لیں۔

نگار خانے والے "ذبیح اللہ" نے ہمیں تحفۂ درویش پیش کیا اور دو منہ مار کر ہم نے بھی پیک اُڑا دی۔ آگے بڑھے تو عدالتی سڑک پر "سبز چائے خانہ" نظر آیا۔ دونوں طرف کتابستان ہے، درمیان میں یہ شرابِ طہور کا مرکز ہے کہ کتابیں بیچنے کا خمار بڑھنے لگے تو ایک پیالی سے نشہ کی تازہ مُہر لگا لی جائے۔

یہ چڑیبیئے، مدکچی، بھنگڑی اور شرابی شعراء کا اڈا ہے۔ کچھ سانگر یعنی قینچی، اُسترے پر دھار رکھنے والے سان کی مستانہ رفتار کے ساتھ آواز ملا کر گنگنانے لگتے تھے، تو آس پاس بیٹھے ہوئے حجّام اور خیّاط حضرات، داد دینے لگتے تھے کہ واللہ حضور! کمال کر دیا ہے۔ شعر کیا ہے شیر ہے۔ سُننے میں آیا ہے کہ بے صبر کا کپوت، دہلی شہر کے چاقو چھری تیز کرنے والی برادری کا اکلوتا حنیف اب اِن ادبی چنڈولوں کا سردار و سرغنہ چُنا گیا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر غیر منقسم ہند کے مشہور ادیب شمار ہوتے تھے، وہ اللہ کو پیارے ہوئے تو اِن لٹیروں نے "عرش" سے تارے توڑ لئے اور عوام کی جیب پر وہ "اکرام" فرمائے کہ اگر حکومت کے عمّال ذرا غور اور سنجیدگی سے کام لیں اور شورش کاشمیری اور ظہور الحسن ڈار اور بیگم تاثیر توجہ کریں تو اِن خبثاء کو کیفرِ کردار پر پہنچایا جا سکتا ہے۔

سبز چائے خانے سے قبرستان کے چوک پر ہماری سواری پہنچی۔ یہ قریشی شیوخ کا چھوٹا بڑا مرکز ہے۔ چودھری جالندھر کے ہوں یا فرخ آباد کے۔ میرٹھ کے ہوں یا دہلی کے۔ لاہور کے ہوں یا سہارنپور کے۔ اِن میں بھی متشاعر کی پیداوار پائی جاتی ہے اور

جو شاعر نہیں ہوتا، وہ اِن مشاعرہ مرچنٹ جیب کتروں کو چائے پیسٹری سے نواز کر کم از کم کسی مشاعرہ کی صدارتِ استقبالیہ ضرور الاٹ کرا لیتا ہے۔ اور جسے خدا کی رضا اور توفیق، بزعمِ خود مل جاتی ہے وہ ساکن چپاتی، پیچتے پیچتے بھی علامہ اقبال کا جانشین ضرور گردانے لگتا ہے اپنے آپ کو۔

قبرستان میں اختر شیرانی اور حسرتؔ کاشمیری کی قبریں دیکھیں اور ان کی بیکسی پر آنسو بہائے کہ یہی ہیں وہ فنکار، جنہوں نے یہاں کے ادیبوں کو شعورِ سخن فہمی اور زورِ بادہ گوئی دیا اور یہی ہیں وہ مُردے جن کے نام پر آج بھی رسالوں اور اخباروں کے "نمبر" شائع ہوتے ہیں لیکن ان کی قبروں کی کس میپرسی کو دیکھنے کی کسے فرصت ہے۔

آنسو پونچھتے ہوئے ہم باہر آئے تو سامنے سے زیدی آتا ہوا دکھائی دیا۔ بولا "وہ مصادرہ والا مسخرہ پھکڑ آج کل ملّا کا بابا بنا ہوا ہے۔ خود تمام عمر "بکواس کی" "کتیا" پالی، اور "بیوی" ایکسچینج کرتا رہا۔ اب غزل گوئی پر ہاتھ صاف کر رہا ہے۔ اور "بھونیو بھنڈار" میں اپنی افضلیت و فوقیت نمایاں کرنے کے لئے پدرم سلطان بود، یعنی باہر سے آنے والے بڑے ادباء وشعراء کی کفش برداری کا سہارا لے رہا ہے۔ زمانہ چھوٹوں کو بڑا اور بڑوں کو چھوٹا بنا رہا ہے، ورنہ سنتے آئے ہیں کہ تھا نقال۔ اب کچھ بھی کہہ لو۔" ہم نے فرمایا کہ چھوڑو میاں! یہ تو خیر کچھ کر دھر بھی لیتا ہے، لیکن اُسے تو دیکھو کہ دانت اُکھاڑتا ہے تو شعر پڑھتا ہے، بتیسی ڈھالتا ہے تو شعر پڑھتا ہے۔ اور طرفہ یہ کہ اگر بتیسی ساز ہے تو غزل بھی بتیس دُونی چونسٹھ مصرعوں سے کم کی نہیں داغتا۔ دنداںؔ تخلص کرتا ہے، کبھی "روشن بیگ" شعر پڑھتا ہے اور آنکھیں گھماتا ہے۔ حضرت پاسِ ابنِ عقل فرماتے تھے کہ اِس کی آنکھیں [illegible] میں گشت کرنے لگتی ہیں۔ دن بھر بیکار رہتا ہے اور کہتا ہے، مصروف بہت ہوں۔ نہ جانے کب گاہک آجائے۔ خدا غارت کرے اِس انقلاب کے نتیجہ کو جس نے ہمیں قلاش کر دیا۔ ورنہ میاں دو ڈھائی سَو روپے ماہوار کما لیتے تھے۔ اب دانے دانے کی محتاجی ہے۔ کھال تو کھال ہڈیاں سوکھ گئیں۔ —— اور ایک یہ کیا اُسے دیکھو چوہڑوں کے جمعدار کو، اب تو سُنا ہے کہ موٹر سائیکل بھی لے لی ہے۔ بڑی بوڑھیوں سے سُنا تھا کہ اگر کوئی نقشیں چہرے والا نظر پڑے تو سمجھ لینا کہ سُریلا ہوگا اور شاعر، لکھنوی ہو یا دہلوی، کسی کی غزل گانے کے لئے اُسے دے دو۔ ایسا معلوم ہوگا کہ اسی کی غزل ہے۔ یہ اقبال نہ صفی پور کا ہے، نہ سیالکوٹ کا، بلکہ یہ ہے حضرت نقشین رُوئے مبارک، اور موٹر سائیکل کا اقبال۔

بھیّا زیدی قائل ہو گئے اور فوراً تلی ہوئی مچھلی ایک پاؤ کھلانے کا وعدہ کر لیا۔ اور بولے کہ صاحب کیا کیجئے، ہم تو بیزار ہو چکے ہیں اِس قوم سے۔ یار مار تو صدیوں میں ایک پیدا ہوتا ہے، لیکن اُستاد مار شاعروں میں روز پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ خود بیچارے احسان کو یہی رونا ہے کہ جتنے شاگرد ملے، سب بے وفا نکلے، مجھ سے بھی کیا لے گئے، رہے بیل کے بیل۔ تاریخ میں زندہ رہ جائے وہ نام سچا۔ نجیب، رئیس، علماء، فصحا، محققین اور مذہبی لوگ پہلے شعر گوئی کا شغف رکھتے تھے، اب یہ آبرو گئی۔ نائی، موچی، قصائی، بساطی، درزی، گھوسی، بڑھئی، سان گر، مچھیرے، دھوبی، نقال، بھانڈ، میراثی محفلِ ادب و شعر کو گھیرے بیٹھے ہیں۔ لہذا میاں اللہ بس باقی ہوس۔

کوپر روڈ اور بیڈن روڈ کے نکڑ پہ مچھلی کھا کر ہم تو نوائے وقت کے دفتر چلے گئے، اور زیدی نے کہا کہ میں جا رہا ہوں زمیندار سے لگان لینے۔ اچھا رخصت آئندہ ملاقات، ہوگی ؎

ؔلہ ایک کتاب کا نام ہے، جس کا تبادلہ ہوا تھا۔

ALMANAR

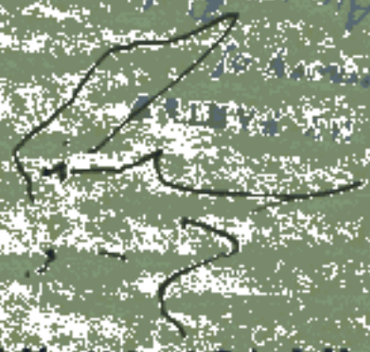

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

MAGAZINE

JANUARY - 1951

ALMANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

MAGAZINE

January - 1951

Professor - in - Charge

Mohammad Ali Chaudhri M.A.

Editor - in - Chief

Munir Ahmad

Associate Editor

Syed Nasir Ahmad

Contents

Vol. One		No. 8
Verse from the Holy Quran		1
Editorial	M. A. Ch.	2
Origin of Language	Habibullah Khan M. Sc.	4
Evening	Ejaz Nabi	6
An Open Air Feast	Junaid Hashmi	7
Pin Pricks	M. A. Ch.	9
A Living Wonder of the World	Hissamuddin Zafar	10
Healthy Ambition	Aslam Chauhan	11
Letters to the Editor	Latif Ahmad M. A. Mahmud	12
Midnight	Shafiq Sehgal	13
Nothing	Mirza Basharat Ahmad	14
Physico - Medical Aspects of Laughter	Syed Nasir Ahmad	15
Wireless Telegraphy	Bashir Ahmad Shah	17

Printed at Insha Press, Urdu Bazar, Lahore and Published by A. R. Junaid for the T. I. College, Lahore.

وانزل الله عليک الکتب والحکمته وعلمک مالم تکن تعلم و
کان فضل الله عليک عظيماً ۔ لاخير فی کثير من نجوٰهم الا
من امر بصدقةٍ او معروف او اصلاح بين الناس ۔ ومن يفعل
ذلک ابتغاء مرضات الله فسوف نو يته اجراً عظيما۔

And Allah has sent down to thee the Book and Wisdom and has taught thee what thou knowest not, and great is Allah's grace on thee.

There is no good in many of their conferences exept the the *conference* of such as enjoin charity, or goodness, or the making of peace among men. And whoso does that, seeking the pleasure of Allah, We shall soon bestow on him a great reward.

—(*Al - Nisa : 114 - 115*)

Editorial

" Sartor Resartus "

ELSEWHERE in the present issue we are publishing a couple of letters. Both relate directly or indirectly to dress or for that matter, national dress. That the problem is real and of great moment could be easily proved if you accompany us on a mental hitch-hike to the different provincial zones of Pakistan. In the N. W. F. P. and the tribal areas, the valiant Pathan is clothed equally valiantly and is carrying all the burden he can. A huge turban tied round a giant sized undercap, a long flowing shirt boasting an embroidered gaudy waist-coat to match, a profuse shalwar with innumerable folds, the unique heavy weight *chappal* and the useful but inevitable spare sheet of long cloth flung loosely across the shoulders, a veritable flood in clothes, enough to clothe half a district in central India. The same is true about Baluchistan and Sindh. But as you approach the Punjab plains the spare sheer is spare no longer. It has replaced the great shalwar. The village dandy is proud of his large and not unoften coloured *Tehband*, his pride vying with its size gathering all the moss in the streets as it sweeps the ground before it. The turban has decreased in size; the undercap has disappeared or else has yielded place to a smarter, much smaller, starched and well-tied *kulah* and turban, not unoften associated with the defunct Unionist Party. As we reach East Pakistan even shoes disappear. The turban is no more. A modest *dhoti* and a small shirt occupy the entire wardrobe of our East Pakistani brother. But that is perhaps as well. For be travels light. In fact, he swims or rows when he travels. Naturally he can't afford to carry a shipload of wet clothes.

The urban areas are a world apart. Take Lahore for instance. To a newcomer, it looks like an international seaport where no too men are dressed alike. The diversity in dress becomes all the more diverse. It is a dream in variety, a real mid summer night's dream. Fez, Jinnah Cap, turban tied in all kinds of style, well combed bare heads, even bald ones, European Caps, in fact, everything is there. The same is true about other items of dress. On the female side too, the discrepancy is as great if not greater. But as long as Purdah is there, this diversity is automatically transformed into uniformity through Burqa.

We find that turban is on the whole the more general head gear, although the Jinnah Cap seems to have captured the imagination of the nation, particularly the younger generation. The letter published in this issue advocating the cause of turban is very pertinent and touches certain very delicate spots in the emotional setup of the nation and should set us all thinking and make us search our hearts. But the trend of the newer generation is unmistakable, They seem to have discarded all headgear. The modern youngman prefers to go about in the extremes of Pakistan climate, with his

head uncovered and bare, a habit medically undesirable And if he says prayers five times a day which he should, a bare head shows the least supplicatory mood, wearing a head gear being a mark of respect in strange contrast with the West where they uncover their heads in similar circumstances. Other head gears are either not popular or are slowly dying out. Except in Bahawalpur, down here The Hon. Sir Mohammad Zafrullah Khan is perhaps the only consistent wearer of the Fez.

Achkan too is not suitable for summer wear. It is not uncommon to find people carrying their achkans on their fore arms. Moreover, it is costly and does not induce active, youthful movement. Bush shirt is another summer substitute but it has to be combined with pants although cases of wearing it with a shalwar are not rare. Dhoti and shalwar are equally popular, the latter being a better dress from the functional point of view. But Dhoti is more widely used. It is interesting to note and sometimes mortifying to find, as we know it to our cost while out hiking in Kaghan, that a Pathan feels insulted if you go about in the streets, in your dhoti. He thinks you have gone stark mad. You just can't imagine his plight if ill-luck happens to land him in certain areas in the Punjab, say some village in the Gujrat District where males and females all dressed in dhoti go about their business as if nothing was amiss.

How to resolve this sartorial confusion? Minor variations and differences of design are unavoidable and are in fact necessary. Variety is the spice of life, and the necessary accompaniment of the differences in tastes and temperaments. But the importance of uniformity in dress cannot be denied. It has an undoubted influence on our psychological and social modes of behaviour. The emphasis on European clothes by the Kemalist Govt. in Turkey, was significant and its consequences are well known. Uniformity, not necessarily sameness, of dress is an index of national unity and cultural homogeniety. Clothes are not as superficial as they seem. That apparel oft proclaims the man' is as true to day as ever. The immaculate and spotlessly dressed Jinnah and the naked Gandhi, except for his loin cloth, represent two ways of thinking, two philosophies of life. in fact, two nations.

With its Unique flexibility, Islam does not prescribe any rigid sartorial code. Common-sense should be obeyed where do's and don's' are absent. Dress must fulfil its minimum function of hiding our nakedness effectively, should protect us against the inclemencies of weather and climate, be within the means of the individual in particular and the society, in general, must'nt be too tight and unhealthy or too loose so that it interferes with easy movement, religious rites and requirements and social decorum. It should'nt be shabby and if possible should satisfy the aethetic sense of a man-in-the-steet though not necessarily that of a fastidious connoisseur of art. And last but not least it should have a close affinity with the type of dress usually worn by Muslims. Again it must not be chosen out of any slavish mimicry of or inferiority complex about the prevailing standards.

Inspite of what has been said above,

(Continued on page 18)

The Origin of Language

IN an earlier issue of Almanar there appeared an article about the origin of language. The writer of the article tried to criticise and disprove some of the theories put forward by the western philosophers, but no suggestions were made regarding its true origin. The problem is not only interesting from the linguistic point of view but also has a special bearing and significance for the Muslims.

The western theorists believe that language is the result of a natural process of evolution and has originated from an attempt on the part of human beings to copy apes and other animals of the jungle. This view is entirely wrong. Man was the last of God's creation. The sun, the moon and stars and far that matter, every thing in the universe was created for him. The laws that govern the universe at the present time were not applicable in the beginning. Everything was created out of nothing. God said : Let there be heaven and the earth and they were there. Everything came into existence as the Almighty wished it to be. We often hear people discussing wherher the hen was created first or the egg. This is entirely foolish. In the beginning God created everything out of his infinite powers without the aid of external agency. There was no chain of cause and effect ; no laws, physical or chemical, were operating. There was no evolution. Things began to develop and the process of evolution started when matter had been created and moulded into different forms. It was a time when God's miraculous powers were being manifested. And when everything was ready, when hills and vales were bedecked with dense foliage, and the rivers flowed their perennial waters into the sea, when all sorts of animals inhabited the land and the air was filled with sweet songs of birds and the fragrance of flowers, man appeared on the face of the earth as the lord of the universe. He was the masterpiece of God's creation—an image of the Creator Himself.

Now does it appear reasonable that, after making such elaborate arrangements for the comfort of man, God would have left him mute and dumb to discover or invent his own method of expression? This is positively against his wisdom and amounts to defeating His own purpose. Has anybody seen a potter breaking his pots and spoiling the fruits of his labour. If a potter will not undo his work then now can we think that the All Powerful and All-Wise God would let His best creation go without the power of speach after having done so much for his comfort. Will not such an act show absolute lack of prudence. Will it not be the very negation of his wisdom. Knowing the requirements of man and also his capabilities and shortcomings, to leave him struggling for some means of expression is simply cruel. Surely such a thing cannot be attributed to a kind and benevolent creator. Just as He had made provision for all man's needs so also He could provide for this necessity. There was nothing to stop Him from revealing a language by which human beings could

give expression to their inner feelings. Since God is above all weaknesses and no defect can be attributed to Him we come to the conclusion that the gift of speach was bestowed upon the first man as a piece of necessity. God revealed to him the names of all objects around him and taught him to speak. Once the language was taught to him, the process of evolution started, and, as the human race moved to different climes new languages and dialects devloped as a matter of course.

This is what reason would have us believe and this is what exactly the Holy Quran teaches us. We are told in Surah Baqrah that God created Adam and taught him the names and attributes of all things. This knowledge made him the supreme ruler and lord of the universe. A man groping in the dark without the power of speech and without the knowledge of things around him is no better than a buffalo or a donkey, in fact no better than even a stone.

There is still another important aspect of this question. Psychology tells us that man can think and dream of things he already knows. If a man knows Urdu only he cannot think and much less talk in the German or French language unless he has learnt it. Similarly if a man has not seen a horse he can form absolutely no picture of that animal. You may give in words as vivid a picture as possible and continue your description for days together using all metaphors and similies at your command, still the man would be no wiser. His concept of the animal cannot correspond to what he actually is. In this connection one is reminded of the famous story of four blind men escrdibing an elephant as a rope, a pillar and a fan. It illustrates the same point. So it is impossible to conceive th ngs or words one is not aware of. There is no exception to this rule.

And yet we find some people uttering words and sentences in languages of which they have absolutely no knowledge. They are common men, not even those who are gifted with extraordinary intellect or exceptional brains. They are only God's chosen ones to whom He reveals His intentions and the future events. They receive revelation from on high not in vague but explicit and clear words free from doubt or ambiguity. To them God speaks and confides His secrets as one would do to a close friend. To them He discloses secrets and foretells great events which it is impossible for any man to know. Nevertheless they come out true in due course and prove the existence of am omnipotent and living God, and, at the same time, establish the unimpeachable character and the bonafides of the person on whom this favour is bestowed. To such chosen ones —mostly his prophets—He sometimes speaks in languages which they do not know, sometimes revelations are received even in a language that is long dead or has fallen out of common use. This He does to establish the truth of such a pesron and to enhance his confidence in His favours.

When God can teach by revelation new languages to-day why could He not do so in the beginning, especially when there was a greater need and a greater necessity for doing so. Certainly He did not leave the first man in a miserable condition, as the western theorists would

(Continued on page 13)

Evening

The sun has gone below the Earth,
Telling the usual approach of night,
And Lo ! the distant western lands,
Have worn the garb of golden light.

The days labour is over at last,
And the people are coming home to rest,
But nobody knows from the life's time,
A day has sunk in the distant West.

Life is but a continuous chain,
Of days and nights and nights and days
But when every eve the crimson rays
Pray in humble and silent strain,
I stare at the world with a vacant gaze,
And feel this may be the last night.

O, this moment this very moment might,
Be the last moment on earth.

The world and life might end to night,
With a sinking heart in the fading light,
I wait.

Ejaz Nabi

An Open Air Feast

(Scavengers of the Air)

"Never stoops the soaring vulture
On his quarry in the desert,
On the sick or wounded bison
But another vulture watching
From his high aerial lookout,
Sees the downward plunge and following
And a third pursues the second,
Coming form the invisible ether,
First a speck and then a vulture,
Till the air is dark with pinions"

CERTAINLY nowhere are the above inimitable lines of Longfellow better illustrated than in our own ancient and slowmoving country, a land where the villager still cultivates his soil as his forefathers did in the days of Harappa and Mohenjodharo.

Every one is completely ignorant of the methods of modern sanitation and hygiene and that we are all dependant for the effective and speedy removal of refuse upon the good offices of the Scavengers of Nature. In times of drought or famine, disease and death work havoc among the weakened cattle-stock and then Nature requisitions the signal services of her scavengers. The traditional practice is to drag or lift by means of bamboos the dead animal and throw it just outside the precincts of the village and there to leave it to putrify the air. After the village skinner has removed its precious hide, no one bothers himself further about the carcase. Hardly has the carcase been out in the open, and indeed often while the skinner (chamar) is still busy with his work, when the Scavengers of the air, the vultures, get busy marshalling their forces. The daring raven and his lieutenant, the grey-necked cousin-are already on the spot, hopping up to the carcase now and again as opportunity offers, tearing away a palatable morsel and hurrying off with it to a neigbouring tree, there to gobble it up piecemeal at ease. Kites have taken the cue and are circling overhead impatiently. Reconnoitring in the blue, the vultures have eagerly watched the manoeuvers of their kith and kin.

It is strange how some vultures sniff and locate their prey from afar. In an amazingly short time an immense flock

will descend from the clear blue sky moment before. Vultures, like human beings, keep an ever watchful eye on the doings of their neighbours and seldom miss an opportunity to do full justice to what good fortune offers them. It is interesting to watch these birds descend on their sumptuous feast. The swiftness with which a party of vultures will dispose of a carcase is simply astounding. No sooner is the stage set for them than the first vulture appears aloft in the blue, wheeling high overhead in majestic circles and peering down anxiouly at the splendid repast below. Presently he believes his eyes and decides to eat, with legs dangling and wings half folded, he descends as it were, an aerial-spiral at a terrific speed, and seeks his perch on a tree nearby. Presently the heavy swish of descending pinions is heard on every side, and soon an array of these guests settle themselves expectantly on the tree-tops around. After some hesitation one of them goaded by a gnawing at his vitals, alights on the ground and tries to satisfy himself that all is well, the eager sort are already at the carcase, tugging and pulling with gusto. Following their example, and perhaps the fear that delay may prove dangerous, the pioneer resolves at last and approaches the carrion and first timidly strives for a nibble. This serves as a food signal to the eagerly watching fraternity. There is soon a mighty flapping of wings. They approach first one by one, and then in batches of twos and threes to join the dinner. The immediate neighbourhood of the dead animal is soon a jostling crowd of vultures. There is much beating of wings, flying of dust and feathers and hideous screeching as they scramble round for a bite, clumsy trippling and dancing with outstretched wings and ungainly-squabbles add to the liveliness of the scene. Often two birds might be seen lying on their backs supported in a semi-erect position by their out-spread wings necks stiffly craned forward-and grappling with one another with their claws over a coveted gobbet. Sometimes a tug of war between two members each pulling away the remnant of the carrion and a hop round would ensue in a determined fashion, while the stateley looking King-Vulture with his naked crimson head looks on. Soon the carcase disappears and only the white skeleton remains to be collected and is finally exported abroad.

Junaid Hashmi

PIN-PRICKS

We had "Discuss and Throw" instead of the usual "Discuss Throw" in the Annual Athletic Tournament this year. Besides being more lively, it has the physical advantage of developing our vocal cords and laryngeal muscles.

●

The much talked of Old Boys Association of the College is reported to have extended its scope by discovering new connotation in its name. Originally an old boy meant an ex-student of the College. Now it means a student who is old, or for that matter, old enough to pay the monthly and membership fees of the Association.

●

It is reported that debates have been completely abolished from the College. This decision is being *debated* very fiercely.

●

The new curtains of the Staff Tennis Club appear almost ironical in there silence. We hope they are not "iron curtains". The moment they are raised all traffic stops in that area and total, deathlike silence prevails all around. What happens behind these curtains is a closely guarded secret for the prying, inquisitive and eager glances of the non-members always stop short of the closed frontiers of the Club. No admittance without passport is the rule.

●

Subsidiary to the grow more trees drive another compaign for growing bushes is being proposed, obviously under the idea that beating about a selfgrown bush is a very much more economic pastime and useless "employment" besides being a sure sign of mental "vacancy".

M. A. Ch.

The Living Wonder of the World!

IT is not possible in this limited space to try to do justice to or even give an outline of the qualities of my fiend —N. A. K. The more I think of him, the more am I lost in the contemplation of his amazing qualities. But more particularly, he is armed with three things—Humour, sportsmanspirit and perseverence.

He is decidedly a great humorist and has the knack of making as well as taking a joke. One day while airing his views on politeness, he remarked that he had never seen an ugly woman. A woman standing nearby, who happened to have a flat nose, overheard him and said, "Sir, look at me and confess that I am ugly". "Madam!" said my freind", Like the rest of your sex you are an angel fallen from the sky, but it is not your fault that you happened to land on your nose"— The company burst into laughter— Again, on several occasions, he has made the whole class laugh by putting witty questions to professors and still more by giving humerous answeres to them. It was only yesterday. that the profesor asked the class to explain the word, "Lighthouse". Many students tried but to no account. "A house which is light", was my friend's reply and it more than satisfied the professor, for the reply seemed to have silenced him completely.

A word or two about his perseverence —this is his sixth year in the second year. Once, on being asked, if he had fallen in love with the Intermediate standard, he boastfully replied, "Examinations are not at all a sure test of ability. My idea of coming to the college was to attain perfect and sound knowledge— and I am pleased that I am successful in achieving this goal". Then he read to me these lines of Longfellow.

"The heights by great men reached and kept,
Were not attained by sudden flight
But they while their companions slept,
Were toiling upwards in the night."

He may not have reached the heights which those greatmen of Longfellow reached, but it is a fact, that he has kept the height he has reached, with the steadfastness of a great man. Nay, more than that. A greatman certainly moves up, if not down but my friend stays where he is. He goes neither up nor down.

As far as I know, at least five different colleges of the Panjab University have the honour of educating my friend. The fact is that he is so huge a man that one college can't absorb him. He is an institu tion in himself.

He is a sportsman in the real sense of the word. "Play up! play up! and play the game", is his motto and gniding principle, and he is playing the game for the last six years. He follows the motto in the bigger field of life as he does in the play-ground. Recently on the occasion of the college prize distribution, he was awarded many prizes for not participating in any game.

(Continued on page 18)

NOTHING

AS I take up my pen to write, I begin to think what should I write about Topics present themselves before me - Is war preventable, can there be world peace, a world state, Communism..... But some I can't write about and some I won't write about. It seems I can't write about anything. But write I must, so let me write about "Nothing". Don't object to my choice of subject for subject doesn't matter. One can write on anything from the life of a great man to the pin lying on the table. You see, there are so many essays containing thoughts almost on everything. We read the logic and philosophy contained in them and we gain, no doubt; but we must provide for diversions. We must provide rest for our tired, overfed minds. A departure from the usual routine makes for change, and deviation from our daily humdrum of life.

If we go on doing one and the same thing all the time, we feel dull and dreary. Spontaneity and variety are the two important ingredients of human happiness. Man must have constant change. Natural beauty is a source of happiness, but if we are always absorbed in beauty, a time comes when we are sick of it. Do not challange the idea, we are to, quickly fed up with everything we try to dwell on. We must try to think about different things at different times, not the same thing at all times.

Don't be led off with the notion that I am against all this thinking or I am opposed to the very natural beauty itseef. Positively not. What I want to emphasise is the necessity of change and varietv.

Having gone, so far let us try to classify our thoughts and actions. Most generally speaking, we can divide them in two general groups Something and 'Nothing'. While we think about ourselves, our surroundings, the very world itself, we are thinking about "Something". When we walk, we run, we leap, we are doing "Something". Our brain and mind is always calculating about "Something". Doesn't it feel monotonous and dull then? Certainly it should, for it is always thinking about "Something". Permit me to suggest a change. Let me point to a diversion from the usual beaten course. Let me invite you to think about "Nothing" for a while.

Reader, when we are brooding over some grim problem facing us, when we sit in an ugly corner of a dark dungeon and brood over our past or future, When our mind is occupied in some thought, we are doing "Some thing". But after we have taxed our brain with thoughts, after we have spent our time away in one awkward position, surely we begin to feel sick of it all and yearn for a change. Then we go out, nay, we run away, out from that gloomy place, we throw away the burden of all those sullen thoughts, and go out in some open place, under some shady tree and sit down there on a block of stone and try

(*Continued on page 18*)

Healthy Ambition

THE only thing that can raise youngmen to the loftiest heights of reputation and power is healthy and sound ambition. It is this desire that can help them in making up their minds for hard work. A young man, who has an intense desire to rise and is determined to rise, never cares to bother about finding people who may give him a push to go up. He depends upon his own intrinsic merit, intelligence, initiative and will. The history of the world is full of the examples of youngmen who had nothing to depend upon except their energy and industry but rose from low to high positions in life and rendered great services to their country, nation and humanity in general. Hitler whose father was a shoe maker rose from a very humble position to be the dictator of Germany. Kamal Ataturk, Stalin, Mussolini, Mao Tse Tung and President Lincoln were not born with silver spoons in their mouths but they chalked out their own career for themselves in life.

Healthy ambition, however, should not be allowed to degenerate into cheap self-seeking and easygoing publicity. An ambitious youngman should dicipline himself to hard work to gain mastery over the world and his own self. Success depends upon being able to do things which one does not like. An ambitions youngman makes the most proper use of his time. Time is the most valuable possession of man in life. A man who is not punctual in life cannot be in a position to attain success. Time is the reciprocal of success. Some body has said, "More people have wrecked their careers by being careless of time than by being careless of money".

Earl of Birkenhead who started his life as a humble man has explained the secret of his successful life in the following lines :—"Life is an adventure. He who fights hard while conceiving ambitiously must be enjoying an adventure". A youngman who sits down Hamlet-like to ponder the consequences of a certain contemplated action will never be able to achieve anything in the world A youngman should be always ready for any work of what ever kind it may be. Recklessness may, to certain extent, be called the ornament of youth. As soon as deliberation, too much thinking and discussion come in, the spirit of youth flies by the back door. It is absolutely necessary that our aims and objects be high enough if we want to do something for humanity.

Aslam Chauhan

Letters to the Editor

To

The Editor, Almanar,
T. I. College,
Lahore.

Sir,

May I point out the most regrettable fact that the so called students of to day show a scant regard for and utter disrespect to our traditional and venerable headgear—Turban. Turban has throughout been the symbol of respectability and prestige and almost all the great Muslims have used it as their head gear. The Holy Prophet (on him be peace and blessings of God) used to wear a turban and has thus sanctified its use for all time to come. His servant and disciple the Promised Messiah too wore a turban. True, the Qaid-i-Azam used to wear a cap and I don't deny the place Jinnah-cap has come to occupy in our hearts on account of the services aud sacrifices of the wearer in the cause of national welfare. But the wearer of the Turban, the Master Prophet Mohammad (on him be peace) was out of all proportion greater than any human being we can conceive of and consequently, we who claim to follow him and relive his faith, must call a halt to this state of affairs and adopt Turban as our national symbol. I think my brother is the only one in the college who wears a turban and ties it in an orthodox style despite the silent smiles of his class fellows. I confess I dont use a turban myself yet I am proud of my brother. Questions and jokes he calmly ignores. I respect him because he tries to identify himself at least in headgear with the Master to whom we all profess to owe allegiance.

Yours etc. etc.
Latif Ahmad

Sir,

The problem of a national dress for Pakistan deserves an immediate attention. It is too well-known to need any comment that unity of dress has a profound effect on and is the symbol of national unity.

Pakistan is a country inhabited by millions of people. It is desirable that a common dress should be adopted so that the people in the different parts of the state may have a unifomity among themselves. Before dealing with the problem, we should keep in view the stern fact that the masses of our country are poor and are unable to afford costly clothes.

There are in the main three forms of dress used in Pakistan *Patloon*, *Shalwar* or *Pyjama* and *Dhoti*. Evidently, Patloon is an alien dress and this very reason should suffice for its abolition. The standard of living of a layman in our country, is so low. Therefore it is equally manifest that this sort of dress is to be included among the luxuries rather than the necessities of life.

Physico Medical Aspects of Laughing

Introduction

In early times many theories were suggested to account for the phenomenon of laughter in the human beings, but the theory suggested here is one which has been modified and improved until at the present time it is held universally.

Hypothesis

"Monirato" in collaboration with "Shefiqot Sehgolov" is the first scientist who put forth the theory that laughing primarily originated from the molecular disturbance caused by the mental sensation. These molecules consist of small particles called "atoms of happiness". When a human being is in an ordinary calm mood, these molecules of happiness some times called "molecular Happinism," are not arranged in one particular direction, but are oriented indiscriminately in all directions. The act of laughing consists in a special orientation towards a particular direction and a specific arrangement of these molecules in a unique pattern or configuration.

"Jamigs Chogoto" is the scientist who put the question to 'Monirato' if the causes of smiling and laughing were different.

Monirato says in reply that the human being who merely smiles means that his molecules of happiness have not yet come in a particular direction but that they happen to be in a curve.

To the second part of his question, he said, when he laughs wholeheartedly it means that the molecules of happiness stand in one particular directional pattern.

Experiment

In proving his hypothesis he performed an experiment before the board of scientists known as the IBDHL: The International Board for the Destruction of Humour and Laughter.

He took Shadi (our old gate keeper) and brought him before the Board. His very appearance being very conspicuous is bound to arrange the molecules of happiness in a certain direction. The result was that smiles appeared on the faces of the Board. Now Monirato asked him to call a boy who had come late on the previous night. The funny way of his utterance brought the molecules completely in one direction and laughing was produced.

Then he proved how the calm position could be obtained.

While the audience were laughing, the Principal of the college entered the room. As soon as the scientists saw the principal, the molecules of happiness were disintegrated indiscriminately in all directions and laughter disappeared.

On this very great research work which he completed during the years 1949-50, he got the "Pebble Prize."

Occurence

It occurs in all kinds of human beings irrespective of colour, creed, sex and age and has a wide range from a mild smile to a loud bray.

Methods of Preparation

I. Jokes produce laughter. Smiles may be obtained as a bye-product.

II. Poor fellow + Jokes = $(Hi)_2$+ $(Hoo_7)_3$+ $(Ha_5)_2$.

III. Production on a commercial scale has dwindled since the raw material used in almost all preparations has been left in or gone to Bharat. It could be produced on a modest scale during the time when the first year admissions are going on. But this method is dangerous and illegal sometime to the actual existence of the scientist in this 'country'.

Physical Properties.

1. Laughter envelopes the whole face making certain parts to shrink and expand. The facial contours change and Swell up like a baloon. The hidden teeth show up in their pearly white grandeur. Jaws open. Specific gravity falls.

2. There is tremendous inhaling and exhaling of puffs of air, in repeated jerky heaving of the belly. The muscles of the larynx are exercised and there is a definite increase in size and weight.

Sometimes the gentleman concerned is reported to have found himself too large for his clothes.

3. Its vapour density is 10 while its atomic weight is 42.0 Its symbol is (Fat)

4. It disobeys the law of Gravity.

Chemical Properties

It is used as an oxidising agent. Whenever it reacts with the blood, the following things are produced.

Laughter+Blood=Red Corpuseles+ Bloedamine.

Uses

(1) It is used to dispel the clouds of sorrow and other toxins. Its theraputical uses have been demonstrably proved in cardiac and hepatic cases particularly when yellow bile is excessive and the individual concerned tends to be melancholic and gloomy. Enlarged doses of laughter have been found to be useful in enlarged spleen.

Excessive dosage is highly toxic and is known to be fatal for the germs of equilibrium, serious thought and gentlemanliness. Too loud varieties of this drug react very seriously on the tympanic membrane and auditory centres of the people nearby and the brain cells of the man himself.——*Syed Nasir Ahmad*

Continued from Page 17

and entertrainment. It is also being used in educating the illiterate masses and its educative value is being increasingly recognised.

A still more wonderful invention is what is called wireless telephony. Just as telegraphy gave rise to telephony, wireless telegraphy has led to the invention of wireless telephony.

All sailing vessels and flying machines are eqiupped with this apparatus, so that while a ship is sailing on the ocean or an aeroplane is flying in the air, the passengers can communicate with people in the four corners of the world. Every police car, in most of the western countries is equipped with a wireless set, so that the investigating officer can always consult the headquarters.

Bashir Ahmad Shah

Wireless Telegraphy

THE age we are living in may well be called the age of electricity. Of late, electricity has made such a phenomenal progress that its past miracles fade into insignificance when compared with its present triumphs. Wireless telegraphy is perhaps the greatest.

In 1835, Cooke and Wheatstone produced the first workable system of electric telegraph, and this was perfected later by Signor Marconi, the inventor of the Morse Code of Signalling. In this system current is conducted from the sender to the receiver by a copper wire, the circuit being completed by the earth itself. The word "telegraph" (from the Greek telos, "distant" and graphs, "to write") was given to the system because it was a way of sending messages to great distances. The telephone ("distance-speaker", from the Greek word phone, "a voice") was invented later, in 1876, by Graham Bell. By this instrument, the actual voice of the speaker can be carried by the electric current along the connecting wire to the hearer at the other end. The telephone converts the sound waves of the voice into electric waves or vibrations, and the receiver at the other end reconverts these electric waves into sound waves, so that the listener hears the speaker's voice.

But now the telephone and the telegraph appear to us as a child's play. We no longer watch them in open mouthed wonder. Up to the year 1895, the only way of conveying messages by electricity was both through telegraphy and telephony but the genius of Marconi invented an instrument by which messages could be conveyed by electricity in the air without the use of connecting wires. In the beginning one could send a message to limited distances. To-day we can flash a message from the South pole to the North pole. The wireless has annihilated time as well as space and it is one of those things which have reduced the whole world to a ship's cabin. Who would have ever dreamt of such a thing in the past?

It is really such a marvellous invention that Marconi himself was amazed at it. It is said that he once entertained a friend at night in his laboratory. The two discussed the most intricate aspects of Wireless Communication. Finally at dawn the friend suggested they should retire. As they were leaving the room, Marconi looked back at his shoulder and said :

"All my life, I have been studying this phenomenon but there is one thing I simply cannot understand about wireless".

"Something you don't understand about wireless ?", smiled the other, "and what's that ?"

Marconi replied, "Why does it work!"

This invention has proved to be a basic theory in one way or another and has led to further developments. From the wireless, the radio was only a natural and inevitable step. The radio, now-a-days is the most popular form of recreation

(*Continued on page 16*)

Continued from Page 10

In his appearance, he is also very funny. His physique is difficult tc describe. It is different from all known geometrical figures. He is the nearest approach to a curve. It would not be out of place if I disclose that he has got an intense dislike for the ringing cf a bell.

For all these reasons. he is invariably discribed as a common denominator, a universal classfellow of the entire college. He creates a stir wherever he goes. In reality, he is an inexhaustible dynamo of mirth and humour and the many university examinations he has taken have been huge, classic jokes, played on a provincial scale.

This year, he is going to cut the greatest joke of his life—he is going to pass!

Hissamuddin Jafar

Continued from Page 3

the problem of our national dress is no nearer solution. Meanwhile Turban or cap, Achkan and shalwar or Pajama form our national dress. It is stately dignified and respectable. It is also our college dress since 1944.

M. A. Ch.

Continued from Page 14

to forget everything. We even try to forget ourselves for a while and sit there in a vacant mood. Apparently we seem to be idly staring at nothing, but, to be sure we are doing "Nothing".

Think for a while, how releaving this retirement is, how soothing, how comforting, how pleasure-giving it is to a heart full of worries; how like a balm it acts for the wounds of the grieved hearts, for the worried souls and to the busy and burdened minds. How relieving are the consequences of this apparently irrelevant thing-how soothing-how comforting.!

But I would never advise you to overshoot the mark. If you give yourself too much relief, you will overdo it and be fed up with it before long. Moreover it will do you harm, positive harm. It is a relieving dose if taken in very small amounts, but a slight overdose it will prove fatal. It will poison your soul and intellect, it will slacken the faculties of your mind, you will feel like the lotos-eaters always feeding on idleness. So please stick to my advice. Neither overdo nor underdo this excercise. Do "Nothing" at times but don't overdo it if you want to do 'Something'.

Mirza Basharat Ahmad